اقبالیات (اردو)

جنوری تا مارچ، ۱۹۶۹ء

مدیر:

بشیر احمد ڈار

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جنوری تا مارچ، ۱۹۶۹ء)
مدیر	:	بشیر احمد ڈار
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	کراچی
سال	:	۱۹۶۹ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۱۰۵
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴ س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

مندرجات

جلد : ۹ | اقبال ریویو : جنوری تا مارچ، ۱۹۶۹ء | شمارہ : ۴

اقبال ریویو

مجلۂ اقبال اکادمی ، کراچی

یہ رسالہ اقبال کی زندگی ، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی ، مثلاً اسلامیات ، فلسفہ ، تاریخ ، عمرانیات ، مذہب ، ادب ، فن ، آثاریات ، وغیرہ ۔

بدل اشتراک

(چار شماروں کے لیے)

پاکستان	بیرونی ممالک
۱۵ روپیہ	۳۵ شلنگ یا ۵ ڈالر

قیمت فی شمارہ

۴ روپے	۹ شلنگ یا ۱.۵۰ ڈالر

مضامین برائے اشاعت

مدیر ''اقبال ریویو'' ۳۳-۶/ڈی ، بلاک نمبر ۶ ، پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی ، کراچی-۲۹ کے پتہ پر ارسال فرماویں ۔ اکادمی کسی مضمون کی گمشدگی کی کسی طرح بھی ذمہ دار نہ ہوگی ۔ اگر کسی مضمون کے ہمراہ ٹکٹ نہ بھیجے جائیں تو اسے واپس نہیں کیا جاتا ۔

ناشر و طابع : بی - اے - ڈار ، ڈائرکٹر ، اقبال اکادمی ، کراچی
مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

مدیر : بی ۔ اے ڈار | معاون مدیر : اے ۔ ایچ کمالی

جلد ۹ | جنوری ۱۹۶۹ مطابق ذیقعد ۱۳۸۸ | شمارہ ۳

مندرجات

غالب کی داستان محبّت

مسلم ضیائی*

یار در عہد شبابم بہ کنار آمد و رفت
ہمچو عیدی کہ در ایام بہار آمد و رفت

مرزا غالب کے ہزاروں دوستوں میں ایک دوست ، مولوی تفضل حسین خان بھی تھے ۔ ان کو ایک غم انگیز اور جانگزا حادثہ پیش آیا ۔ غالب اور تفضل حسین خان کے ایک مشترک دوست اعتقادالدولہ نوروز علی خان تھے ۔ انہوں نے غالب کو اپنے نام تفضل حسین خان کا نامہ غم دکھا کر چاہا کہ غالب خط لکھ کر تفضل حسین خان کا غم غلط کریں ۔

غالب نے اپنے خط میں تعزیت اور اظہار ہمدردی کے ساتھ اپنی داستان محبت کی اس طرح نقاب کشائی کی ہے :

" بروزگار جوانی . . . مرا نیز زہراب ایں بلا (مرگ دوست) ساغر ریختہ اند و برہگذار جنازۂ دوست غبار از نہاد شکیبم برانگیختہ ۔ روز ہاے روشن بماتم دلدار پلاس نشین و کبود پوش بودہ ام و شبہائی سیاہ بخلوت غم پروانہ ، شمع خموش بودہ ام ۔ ہمخوابہ کہ وقت وداع از رشک جدایش نتوان سپرد ، چہ بیداد است ، تن نازنینش را بخاک سپردن و محبوبہ کہ از بیم چشم زخم نرگس بہ گلگشت چمن نتوان برد ، چہ ستم است نعش او را بگورستان بردن ۔

خاک خون باد کہ در معرض آثار وجود
زلف رخ در کشد و سنبل و گل بار دہد

صیاد دام گسستہ ، صید از بند بدرجستہ را ، بآسودگی چہ پیوند ؟ و گلچین گل از دست دادہ ، گلبن از پا فتادہ را ، بخرمی چہ آمیزش ؟ تن دادن شاہد بہمدی عاشق ، اگرچہ پس از یک عمر جانفشانی است ، دل دادگان دانند کہ چہ پایہ مہرورزی و مہربانی است ۔ خوشا معشوقہ وفا سگال کہ تلافی را از بایست پایہ تر نہادہ باشد و از ہر کہ بغمزۂ دل بردہ ہم بمہرش جان دادہ باشد !

*آقائی مسلم ضیائی ، دانشمند معروف کراچی ۔

با این ہمہ کہ غم مرگ دوست جانگزاست و اندوہ جدائی جاوید جگر پالان . . .''[1]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تفضل حسین خاں کو خط لکھتے ہوئے غالب کو اپنی جوانی کا افسانۂ غم یاد آ گیا تھا جب انہوں نے محبت کی تھی اور ان کی محبوبۂ دلنواز کی وفات نے ان کی زندگی کو تاریک اور ویران کر دیا تھا ۔ یہ محبوبہ غالب سے والہانہ محبت کرتی تھی ۔

ایک اور خط میں حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ چنّا جان کے مرنے پر تعزیت نامہ لکھتے ہوئے اپنی داستانِ محبت کی اس طرح پردہ کشائی کرتے ہیں :

بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں ، جس پر مرتے ہیں ، اس کو مار رکھتے ہیں ۔ میں بھی مغل بچہ ہوں ، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے ۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی ، کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں ، مغفرت کرے ۔

چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے ۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا ۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں ، پھر بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں ۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا ۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی ۔[2]

یہ خط جون ۱۸۶۰ (ذی قعدہ ۱۲۷۶) میں لکھا گیا کیونکہ چنا جان کی وفات ۹ ذی قعدہ ۱۲۷۶ (۲۹ مئی ۱۸۶۰) کو ہوئی تھی[3] ۔ اگر ہم اس میں سے بیالیس سال منہا کریں تو (۱۲۷۶ — ۴۲ = ۱۲۳۴ م ۱۸۱۸ء) غالب کی محبوبہ کا سال وفات قرار پاتا ہے جب غالب کی عمر ۲۱ ، ۲۲ سال تھی[4] ۔ قیاس کہتا ہے کہ اس ستم پیشہ ڈومنی سے غالب کے معاشقے کی عمر زیادہ طویل نہ تھی ، بس ایک دو سال یعنی غالب نے اس ستم پیشہ ڈومنی سے انیس بیس سال کی عمر میں عشق کیا تھا ۔ لیکن یہ ستم پیشہ ڈومنی کون تھی ؟ غالب نے اس کے بارے میں کیا اور کس طرح لکھا ہے ؟ ہمیں سرور کے عمدۂ منتخبہ سے اسد تخلص

۱۔ پنج آہنگ ۔ نولکشور ۔ لکھنو ، ۱۹۷—۱۹۹ ۔
۲۔ اردوے معلی (دہلی ۱۸۶۹)، ۲۵۲ ۔
۳۔ دیوان مہر (مطبع الٰہی ۔ آگرہ) ، ۳۷۴ ۔
۴۔ اگر ۱۲۱۳ سال ولادت مان لیا جائے تو ۲۰ ، ۲۱ سال ۔ ملاحظہ ہو اردو نامہ جنوری ۱۹۶۷ '' غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت '' ۔

کے تحت غالب کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ :

. . . جوان قابل و یار باش دردمند ۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ ذوق ریختہ گوی در خاطر متمکن ، خو کردۂ غم ہائے عشق مجاز ، تربیت یافتہ غمکدۂ نیاز در فن سخن سنجی متبع محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمتہ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند ۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد ۔[۵]

چونکہ سرور سے رابطۂ یک جہتی مستحکم تھا اس لیے وہ یقیناً غالب کے غمہائے عشق "مجاز" سے واقف تھے ۔ اگرچہ ان کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت غالب طرز بیدل چھوڑ کر "موجد طرز خود" ہو چکے تھے اور ابھی تک خوش معاشی سے زندگی بسر کر رہے تھے ، لیکن افسوس سرور نے اجمال سے کام لیتے ہوئے غالب کے غمہائے عشق مجاز پر روشنی نہیں ڈالی ۔ آئیے ہم غالب ہی کی تحریروں سے اس داستان عشق کی مختلف کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کریں ۔

ہماری زبان میں ڈومنی کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا لیکن "ستم پیشہ ڈومنی" لکھتے وقت غالب کے ذہن میں کیا تھا ؟ اس کی تفصیل غالب ہی کی زبانی سنیے ۔ اپنے دوست ، منشی نبی بخش حقیر کو "مغاں شیوہ بانوان"[۶] کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف جمع کا ہے یعنی بیبیاں ۔ مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل رخسار اور ماہ جبین کی ترکیب ہے یعنی وہ شخص جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی ہے اور شیوہ مغاں

۵- عمدۂ منتخبہ خطی : سرور نسخۂ قومی آثار خانہ ، کراچی ۔
۶- غالب نے مغاں شیوہ کی ترکیب کلیات فارسی میں کئی جگہ استعمال کی ہے :

زہے بتان مغاں شیوہ داد خواہانش
زدست ہائے حنا بستہ گل بدامانش

مسکین نہ دیدۂ ز مغاں شیوہ بانوان
در خوابگاہ بہمن و دارا گریستن

ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہدان
فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار

آتش ہنگامہ بجان داشتی
داغ مغاں شیوہ بتان داشتی

کا سا ہے ۔۷ مغ آتش کدے کا کارفرما اور چونکہ بادشاہان پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدوں کی عابد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے اور شراب بھی (چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک اور متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے) مغوں کی تحویل میں رہتی تھی تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل جانیں ، اس کو بقدر مناسب دیں ۔ بہرحال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوبصورت اور خوش سیرت ، عالم فاضل طرحدار ، بذلہ گو ، حریف ظریف ہوا کرتے تھے ۔

اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ ، مدح معشوقوں کی ٹھہرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور ترچھا اور بانکا مانند مغوں کے ۔ اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہے کہ جیسے کسو بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے ۔

قصہ مختصر ، مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے ہیں جو بہت گرم اور شوخ اور شیریں حرکات اور چالاک ہو ۔

مغاں شیوہ بانواں ، مغاں شیوہ دلبراں ، مغاں شیوہ شاہداں ، خواہی بہ مجمع ، خواہی بہ انفراد ، ترکیب مقلوب ہے یعنی بانواں مغاں شیوہ ۔ قس علی ہذا اور الفاظ . . . ''۸

غالب کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں یہی مغاں شیوہ ، ستم پیشہ ڈومنی تھی جو کوئی شاہد بازاری نہ تھی بلکہ گرم ، شوخ ، شیریں حرکات ، چالاک ، خوش بیان ، طرحدار ، بانکی ترچھی سروقامت حسینہ تھی (جس کا سراپا غالب نے اپنی اردو اور فارسی شاعری میں کئی جگہ لکھا ہے) جس کے بدن پر اس کی قبائے تنگ ، کلی کی طرح کھلی جاتی تھی ۔ یہ وہی مطربہ ہے جس کے بارے میں غالب نے اپنی غزلوں میں بار بار لکھا ، جس کی شیریں حرکاتی کا مثنوی ابر گہر بار میں ذکر کیا۹ اور جسے زندگی بھر یاد کرتے رہے ۔

کار با مطربہ زہرہ نہادی دارم گر لبم نالہ ہنجار سراید چہ عجب

۷- مغ : مرد روحانی زرتشتی پیشوائے مذہبی زرتشتی ، مغان (جمع) طبقہ پائیں تر از موبدان بودہ اند ، فرہنگ عمید ، تہران ۔

۸- سید آفاق حسین ، نادرات غالب ۔ خط بنام حقیر نوشتہ ۴ جون ۱۸۴۸ ، ۳۰۳ ۔

۹- نہ نازک نگاری کہ نازش کشم | بہر بوسہ زلف درازش کشم
گریزد دم بوسہ اینش کجا | فریبد بسوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گو | دہد کام و نبود دلش کام جو

شیوۂ دارد و من معتقد خوی ویم   شوقم از رنجش او گر بفزاید چہ عجب

پھر اسی ''رہزن تمکین و ہوش'' مطربہ زہرہ نہاد اور بت ''چمن سامان'' کے بارے میں کہتے ہیں :

چمن سامان بتی دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامی کز ادائے خویش پر گل کردہ دامان را
چو غنچہ جوش صفائی تنش ز بالیدن
دریدہ برتن نازک قبائے تنگش را

نسخۂ فوجدار (ف) نوشتہ صفر ۱۲۳۷ کے یہ اشعار بھی لائق توجہ ہیں :

اگر وہ سرو جان بخش خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو
بہ یاد قامت اگر ہو بلند آتش غم
ہر ایک داغ جگر آفتاب محشر ہو
صدف کی ہے ترے نقش قدم میں کیفیت
سرشک چشم اسد کیوں نہ اس میں گوہر ہو
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

یہی وہ سرو قامت محبوبہ ہے جسے حوران بہشت اور خوبان روزگار پر ترجیح دیتے ہیں :

نخواہم از صف حوران ز صد ہزار یکی   مرا بس است ز خوبان روزگار یکی

اسی محبوبہ دلنواز کا سراپا لکھتے ہوئے ، اس کی کافرادای ، بالا بلندی ، کوتہ قبای ، مینو لقای ، غافل نوازی ، عاشق ستای ، زردشت کیشی ، آتش‌پرستی اور زمزمہ سرای کا ذکر کرتے ہوئے اس کا حسن ، اس کی موسیقی ، اس کا مزاج ، اس کی تابش تن اور اس کی ادائیں بیان کرتے ہیں ۔ یہ اس عورت کا جسمانی اور ذہنی سراپا ہے جس کی زلف پر خم کے غالب اسیر ہوئے تھے ۔ ملاحظہ ہو :

تاہم ز دل برد کافر ادائے   بالا بلندے کوتہ قبائے
از خوے ناخوش دوزخ نہیبے   وز روے دلکش مینو لقائے
در دیر گیری غافل نوازے   ور زود میری ، عاشق ستائے
زردشت کیشے ، آتش پرستے   برسم گزارے ، زمزم سرائے
چون مرگ ناگہ بسیار تلخے   چون‌جان شیرین اندک وفائے
ورکام بخشی ممسک امیرے   در دلستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے پوزش پذیرے   طاقت گدازے صبر آزمائے
در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے   در مہربانی بستان سرائے

از زلف پرخم مشکین نقابے | از تالبش تن زرین ردائے
در عرض دعوئ لیلی نکرہے | بر رغم غالب مجنوں متائے

ایک اور غزل میں اس مغان شیوہ محبوبہ سے اپنے آغاز عشق کی داستان سنائے ہیں جب اس مغنیٔ آتش نفس ''شوخ اور شیریں حرکات'' مطربہ سے محبت کرتے تھے اور ابھی خود اس کے محبوب نہ ہوئے تھے ۔ اس ''نادان صنم'' کا حال انھی کی زبان سے سنیے :

نادان صنم من روش کار نداند	بر ہر کہ کند رحم ، سر از بار نداند
بی دشنہ و خنجر نبود معتقد زخم	دلہائے عزیزان ، بہ غم افگار نداند
برتشنہ لب بادیہ سوزد دلش از مہر	اندوہ جگر تشنۂ دیدار نداند
گویم سخن از رنج و براحت کندش طرح	روز سیہ از سایۂ دیوار نداند
دل را بغم آتش کدہ راز نہ سنجد	دم را بہ تف نالہ شرر بار نداند
عنوان ہوا داری احباب نہ بیند	پایان ہوسناکی اغیار نداند
دشوار بود مردن و دشوار تراز مرگ	آنست کہ من میرم و دشوار نداند
دانم کہ ندانست و ندانم کہ غم من	خود کم تر از آنست کہ بسیار نداند
از نا کسی خویش چہ مقدار عزیزم	در عربدہ خوارم کند و خوار نداند

پھر اس نادان محبوبہ کو راست مخاطب کرتے ہوئے کبھی اس کے نقش کف پا کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس کے گریبان کو رونق صبح بہار کہتے ہیں :

اے گل ! از نقش کف پاے تو دامان ترا
گلفشان کردہ قبا سرو خرامان ترا
تا ز خون کہ ازیں پردہ شفق باز دمد
رونق صبح بہار است گریبان ترا

کبھی آئینہ خانے میں اس کا جلوہ وہ نقشہ پیدا کرتا ہے جو شبستان میں آفتاب نکلنے پر نظر آتا ہے ۔ کبھی اپنی ''ناہید'' کی تمثال کا سیابی جلوہ دیکھتے ہیں تو سینکڑوں ذرے دیدہ ہائے خاک کے مانند ، پر افشاں نظر آتے ہیں ۔ کبھی اس کے نقش قدم میں ''خیابان خیاباں ارم'' اور سرو قامت میں قیامت کا فتنہ ، مگر ایک قد آدم کمی کے ساتھ نظر آتا ہے اور کبھی اس ''محو آئینہ داری'' کو بڑی تمناؤں سے دیکھتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں[۱۰] :

۱۰۔ کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا
یہ کس ناہید کی تمثال کا ہے جلوہ سیابی
کہ مثل دیدہ ہائے خاک ، آئینے پر افشاں ہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محو آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ساتھ ہی اس کی آرایش کو دیکھ کر دل میں اندیشہ ہائے دور و دراز بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی گرفتاری کا بھی احساس ہے اور قوت پرواز کا بھی اندازہ ہے۔ حسرت ناز کے بجائے "ناز کھینچنے" کی بھی آرزو ہے۔

تو اور آرایش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

لاف تمکیں فریب سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتار الفت صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

وہ بھی دن ہوں کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز!
اے ترا ظلم سر بسر انداز!

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزش سجدہ ہائے اہل نیاز

نگہ التفات سوے اسد
میں غریب اور تو غریب نواز

اسی محبت کے دور میں، آغاز الفت کے زمانے میں اپنی محبوبہ کو ایک منظوم خط لکھتے ہیں جس میں تعریف بھی ہے اور شکایت بھی:

زہے باغ و بہار جان فشانان!
غمت چشم و چراغ راز دانان

بصورت اوستاد دل فریبان
بمعنی قبلہ نا مہربانان

چمن کوے ترا از رہ نشینان
ختن سوے ترا از باد خوانان

بلایت چہرہ با مشکینہ مویان
ادایت چہرہ بر نازک میانان

غمت را بختیان زنار بندان
گلت را عندلیبان بید خوانان

وصالت جان توانا ساز پیران
خیالت خاطر آشوب جوانان

دل دانش فریبت را بگردن
وبال رونق جادو بیانان

غم دوزخ نہیبت را بدامن
گداز زہرۂ آتش زبانان

میانت ہائے لغز موشگافان
دہانت چشم بند نکتہ دانان

دل از داغت بساط گل فروشان
تن از زحمت ردائے باغبانان

سگ کوی ترا از کاسہ لیسی
لب پر دعوی شیرین دہانان

سر راہ ترا در خاک روبی
نسیم پرچم گیتی ستانان

بہ بشتی بانی لطف تو امید
قوی ہمچون نہاد سخت جانان

بیالا دستیٔ عفو تو عصیان زبون ہمچوں نشست تا توانان
ز ناحق کشتگان راضی بجانت کہ غالب ہم یکی باشد ازانان

اس غزل میں اپنی مغاں شیوہ محبوبہ کے انداز دلربایانہ اور اوصاف معشوقانہ بیان کرتے ہوئے اس کے مزاج کے تضادات بھی بیان کیے ہیں ۔ وہ باغ و بہار جانفشانان ہے اور اس کا غم چشم و چراغ راز داناں ۔ دیکھنے میں تو اوستاد دل فریباں ہے لیکن حقیقت میں قبلۂ ناسمرداناں ۔ اس کا کوچہ رہ نشینوں کے لیے چمن ہے اور موئے سیاہ ختن کے مانند معطر ۔ سیاہ زلفوں والی حسینائیں اسے دیکھ کر جلتی اور عنادل اس کے گل رخسار پر زمزمہ سنجی کرتی ہیں ۔ وہ ایسی حسینہ ہے جس کا وصل ''توانا ساز پیران'' ہے اور جس کا خیال جوانوں کے لیے ''خاطر آشوب'' ۔ اس کے سامنے جادو بیانوں کی دانش مندی ختم ہو جاتی ہے اور آتش زبانوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں ۔ اس کی کمر ''موشگافوں'' کے پیروں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے اور اس کی گفتگو بڑے بڑے نکتہ دانوں کو چپ کرا دیتی ہے ۔ کتنے ہی لوگ ہیں جن کے داغ دار دل ، بساط گل فروش بنے ہوئے ہیں اور جن کے زخمی دل ، باغبانوں کی پھولوں سے بھری ہوئی چادر نظر آتے ہیں ۔ بادشاہوں کے پرچموں سے نکلی ہوئی نسیم ، اس کی گلی میں خاک روبی کرتی ہے اور اس کی مہربانی سے امید ، سخت جانوں کے دلوں کے لیے قوی اور مضبوط ہو جاتی ہے ۔ آخر میں کہتے ہیں کہ ان ''ناحق کشتگاں'' میں جو تیرے لیے خوشی سے جان دیتے ہیں ، ایک شخص اور بھی ہے ، جسے غالب کہتے ہیں ۔ وہ بھی تجھ سے محبت کرتا اور تیرا ہی مارا ہوا ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف ''عیسیٔ مہربان'' کے مانند محبوبہ تھی اور دوسری طرف ''طبع الم خیز'' درد آفرینی میں مشغول تھی ۔ زندگی کشمکش کے ایک عجیب و غریب دور سے گزر رہی تھی :

عیسیٔ مہربان ہے شفاء ریز یک طرف
درد آفرین ہے طبع الم خیز یک طرف
مفت دل و جگر خلش غمزہ ہائے ناز
کاوش فروشیٔ مژۂ تیز یک طرف
ہر مو بدن پہ شہپر پرواز ہے مجھے
بے تابی دل تپش انگیز یک طرف
یک جانب اے اسد غم فرقت کا لم ہے
دام ہوس ہے زلف دل آویز یک طرف

یہ وہ زمانہ ہے جب غالب ہی نہیں غالب کا عشق بھی شباب پر ہے اور اب وہی نہیں ان کی محبوبہ بھی ان سے محبت کرنے لگی ہے ۔ اس زمانے کی

داستان شوق اس طرح سناتے ہیں ۔

شدم سپاس گذار خود از شکایت شوق　　زہے ز من بدل بیغمش سرایت شوق
بزم بادہ گریباں کشودنش نگرید　　خوشا بہانہ مستی ، خوشا رعایت شوق
بر آں غزل کہ سرا خود بخاطر است ہنوز　　ببانگ چنگ ادا می کند بغایت شوق
دخاں ز آتش یاقوت ، گردمد عجب مت　　عجب تر است ازیں برلبش حکایت شوق
غلط کند رہ و آید بہ کلبہ ام ناگاہ　　صنم فریب بود ، شیوۂ ہدایت شوق
متاع کاسد اہل ہوس بہم بر زن　　کنوں کہ خود شدۂ شحنہ ولایت شوق
بخود مناز و بہ آموز گار ہم بپزیر　　من و نہایت عشق و تو و ہدایت شوق

وہ اپنی محبوبہ کی طرف سے شکایت شوق پر سپاس گزار ہیں کیونکہ اب ان کی محبوبہ کے دل میں ان کی محبت نے گھر کر لیا ہے ۔ وہ محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر بزم شراب میں مستی و مدہوشی کا بہانہ کرکے آتی اور بندوق کا وار کر دیتی ہے ۔ اپنے چنگ پر وہ غزل سناتی ہے جو ابھی شاعر (غالب) کے ذہن ہی میں ہے اور لکھی نہیں گئی یعنی خود عاشق ہو کر عاشق کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ یہ محبت کا جذبہ ہی تو ہے جس نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ غالب یہ کیفیت دیکھ کر حیران رہ جاتے اور کہتے ہیں کہ اگر آتش یاقوت سے دھواں روشن ہو جائے تو حیرت نہ کرو ۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میری محبوبہ کے ہونٹوں پر میری محبت کی داستان ہے ۔ وہ اچانک میرے جھونپڑے میں "راستہ بھول" کر آتی ہے ۔ عشق کی رہنمائی کو دیکھو کس قدر صنم فریب ہے ! اے میری محبوب ! اب چونکہ تو خود "شحنہ ولایت شوق" ہے اس لیے اہل ہوس کی متاع کاسد کو تباہ کر دے ۔

لیکن اے میری محبوب ! غرور نہ کر ۔ میں جو کہتا ہوں ، اسے مان لے کیونکہ میرا عشق انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور تیری محبت کی نقط ابتدا ہے ۔

اور اب دو نوجوان دلوں میں محبت کی آگ بھڑک رہی تھی ۔ غالب خود اپنے دل کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں :

سینہ بکشودیم و خلقی دید کاینجا آتش است
بعد ازیں گویند ، آتش را کہ گویا آتش است

انتظار جلوۂ ساقی کبابم می کنند
مے بساغر آب حیوان و بہ مینا آتش است

گریہ ات ، در عشق از تاثیر دود آہ ماست
اشک در چشم تو آب و در دل ما آتش است

ای کہ می گوئی تجلی گاہ نازش دور نیست
صبر مشتی از خس و ذوق تماشا آتش است

دوسری طرف محبوبہ کے دل میں محبت کی آگ جل رہی ہے۔ دود آہ کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ آنسو محبوبہ کی آنکھوں میں پانی کے قطرے ہیں لیکن غالب کے دل میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اس لیے وہ کسی ہمدرد اور غمگسار دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ اس کی تجلی گاہ شوق دور نہیں۔ مانا۔ مگر یہ بوی تو سمجھ لو صبر مشت خس ہوتا ہے اور ذوق تماشا آگ، جو ایک لمحہ میں صبر و سکون کا سرمایہ غارت کر دیتی ہے۔

یہ دور غالب کی زندگی میں انتہائی ہیجانی دور ہے۔ راتوں میں کبھی آہیں ہیں، کبھی خاموشی، انتظار ہے، اضطراب ہے، بے چینی ہے اور تڑپ ہے، کسی پہلو چین نہیں، کسی پہلو آرام نہیں، ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے:

جنون محمل بہ صحرائے تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر واماندہ است امشب

بہ ذوق وعدہ، سامان نشاطے کردہ پندارم
ز فرش گل، بروے آتشم، بنشاندہ است امشب

بقدر شام ہجرانش، درازی باد عمرش را
فلک نیز از کواکب سبحہ وا گرداندہ است امشب

بخواہم می رسد بند قبا وا کردہ از مستی
ندانم شوق من بروے چہ افسون خواندہ است امشب

خوش است افسانہ درد جدای مختصر غالب
بہ محشر می توان گفت آنچہ در دل ماندہ است امشب

غالب کو اپنی محبوبہ کے آنے کا انتظار ہے، اس نے وعدہ کیا ہے آنے کا۔ وہ سامان نشاط فراہم کرتے اور پھولوں کی سیج آراستہ کرتے ہیں لیکن اس کی غیرموجودگی میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پھولوں کی سیج پر نہیں، آگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جنون محبت نے عالم تحیر میں پہنچا دیا ہے۔ نگہ آنکھوں میں اور آہ جگر میں ٹھہر گئی ہے۔ اپنی محبوبہ کو دعائیں دیتے ہیں کہ اس کی عمر کو درازی شب ہجراں نصیب ہو۔ آسمان بھی ستاروں کی تسبیح لیے سبحہ گردانی میں مشغول ہے۔ ایسی حالت میں (عالم تصور میں) محبوبہ بند قبا وا کیے ہوئے آتی ہے اور غالب حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر میری محبت نے ایسا کون سا فسوں پڑھ دیا، جس کے باعث میری محبوبہ بند قبا وا کیے

ہوئے میرے پاس چلی آئی ہے ۔ آخر میں کہتے ہیں ۔ یہ افسانہ درد جدائی مزے دار بھی ہے اور طویل بھی ۔ میں نے اسے مختصراً بیان کیا ہے ۔ آج میں اسے بیان نہیں کرتا ۔ قیامت کے روز خدا سے کہوں گا کہ آخر تو نے فراق محبوب کو اتنا طول کیوں دیا تھا ۔

اس کے بعد ایک اور فراقیہ غزل میں کبھی موج گل کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بیقراری اور محبت کا اظہار کرتے ہیں کبھی ''طرف جوئبار چمن'' کبھی داغ لالہ ، کبھی آنکھوں اور کبھی رات سے کہتے ہیں :

اے موج گل نوید تماشائے کیستی ؟
انگارۂ مثال سراپائے کیستی ؟

بیہودہ نیست سعی صبا در کنار ما
اے بوے گل ! پیام تمنائے کیستی ؟

خون گشتم از تو ، باغ و بہار کہ بودہ ای
کشتی مرا بغمزہ ، مسیحائے کیستی ؟

یادش بہ خیر تا چہ قدر سبز بودہ ای
اے طرف جوئبار چمن جائے کیستی ؟

از خاک غرقۂ کف خونی دمیدۂ ای
اے داغ لالہ ! نقش سویدائے کیستی ؟

نشنیدہ لذت تو فرومی رود بدل
اے حرف محو لعل شکر خائے کیستی ؟

با نو بہار ایں ہمہ سامان ناز نیست
فہرست کارخانۂ یغمائے کیستی ؟

از ہیچ غیر نقش نکوئی ندیدہ ای
اے دیدہ ! محو چہرہ زیبائے کیستی ؟

با ہیچ کافر ، این ہمہ سختی نمی رود
اے شب ! بمرگ من کہ تو فردائے کیستی ؟

غالب نوائے کلک تو دل می برد ز دست
تا پردہ سنج شیوہ انشائے کیستی ؟

محبت کے اس طوفانی دور میں عشق بھی تھا حجاب میں ، حسن بھی تھا حجاب میں ۔ قدم قدم پر کھٹکے تھے ، قدم قدم پر اندیشے تھے ۔ کبھی ہم رقیب تھا ، کبھی خوف عزیزاں ، رسوائیاں تھیں اور بدنامیاں ۔ دن تو بہر حال کٹ جاتے تھے لیکن راتیں اپنے ساتھ قیامتیں لاتی تھیں ۔ جب فراق کی تاریکیاں محبت کی

روشنی کو اندیشوں کے اندھیروں میں چھپا دیتی ہیں ۔ اپنی محبوبہ ، اپنی جان سے زیادہ عزیز ہستی کے بارے میں شبہات پیدا ہوتے ہیں جن سے بے تابیوں ، اضطراب اور وحشت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر جب فراق کی ہر ایک ہی نہیں کئی راتیں ہوں تو کبھی ''زبان سوزد'' کا معاملہ ہوتا ہے اور کبھی ''مغزاستخواں سوزد'' کا۔ ان کربناک اور وحشت انگیز راتوں میں سے ایک رات کی داستان یوں بیان کرتے ہیں کہ :

''کل میں تجھے اپنی سیہ بختی کی داستان سنا رہا تھا ۔ نظریں آسمان کی طرف تھیں لیکن روے سخن تیری ہی طرف تھا ۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ رات کو تیری وجہ سے محفل خوباں میں لوگوں پر کیا گذری ؟ خصوصاً صدر مجلس پر جو تیری ہم پہلو تھی ؟ تو نے شمع پر گمان کیا اور غضبناک ہو کر چلی گئی ۔ اس میں شمع کا کوئی قصور نہ تھا ۔ یہ تو میری آہ گرم تھی جس نے تیرے مزاج کی پردہ کشائی کی تھی۔ میں اپنی آہ آتشناک سے جنت کو جلا کر خاکستر کر رہا ہوں تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ تیرے کوچے کی ہمسری کا دعویٰ کر رہی تھی ۔ باد بہاری کی روش سے یہ گمان ہوتا ہے کہ باغ کے سارے پھول اور کلیاں تیری ہی خوشبوؤں کے قافلے کے پیچھے چل رہی ہیں ۔ خدا کرے مرنے کے بعد غالب کی قبر کے اردگرد لالہ و گل کھلتے رہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں تجھے دیکھتے رہنے کی کس قدر خواہش تھی :

دوش کز گردش بختم گلہ برروے تو بود
چشم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود

آنچہ شب شمع گمان کردی و رفتی بعتاب
نفسم پردہ کشای اثر خوے تو بود

شب چہ دانی ز تو در مجلس خوباں چہ گزشت
خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود

خلد را از نفس شعلہ فشان می سوزم
تا ندانند حریفان کہ سر کوے تو بود

روش باد بہاری بہ گمانم افگند
کاین گل و غنچہ پے قافلۂ بوے تو بود

لالہ وگل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روے تو بود

لیکن بات صرف اتنی نہ تھی ، غالب کی یہ فراقیہ راتیں اور ان میں اس کے دل کی دھڑکنوں کو شاعر نے مستقبل کے لیے اپنی غزلوں میں محفوظ کر دیا ہے ملاحظہ ہو :

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر جو بے تاب تھا

دیکھتے تھے ہم بچشم خود وہ طوفان بلا
آسمان سفلہ جس میں یک کف سیلاب تھا

اور یہ ایک برسات کی رات تھی ، اندھیری رات جس میں شاعر کی بے چینیوں اور اندیشوں کے بادلوں کا ہجوم تھا ۔ دل باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن طبیعت پر عجیب وحشت سی چھائی ہوئی تھی :

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بے تابیاں
شوخیٔ بارش سے مہ فوارۂ سیماب تھا

جوش یاد نغمۂ دمساز مطرب سے اسد
ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا

اور اب اسی زمانے کی ایک اور بھیگی ہوئی رات کا منظر دیکھیے جس میں شاعر نے اپنی افسردگی و بیتابی اور اندیشہ ہائے دور و دراز کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں خود آرای کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

یاں سر پر شور، بے تابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

واں بجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسد
ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا[۱۱]

اس زمانے میں غالب نے ایک غزل لکھی جس کی ردیف ''دوست'' ہے ۔ یہ غزل نسخہ فوجدار محمد خاں میں ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

برق خرمن زار گوہر ہے نگاہ تیز یاں
اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمی رفتار دوست

ہے سوا نیزے پہ اس کی قامت نو خیز سے
آفتاب صبح محشر ہے گل دستار دوست

اے عدوے مصلحت! چندے بہ ضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تاب شوخی دیدار دوست

لغزش مستانہ و جوش تماشا ہے اسد
آتش مے سے بہار گرمی بازار دوست

نسخہ شیرانی میں یہی غزل تھوڑی سی ترمیم اور چند اشعار کے اضافوں کے ساتھ اس طرح ملتی ہے :

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر گر چہ تھا بیمار دوست

چشم ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پر خوں ہمارا ساغر سرشار دوست

(ق)

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

۱۱۔ مندرجہ بالا میں پہلی دو غزلیں نسخہ فوجدار محمد خاں (بھوپال) میں اسد تخلص کے تحت اور تیسری حاشیہ پر اور نسخہ شیرانی لاہور میں ہے ۔ نسخہ شیرانی نسخہ فوجدار سے نقل کیا گیا لیکن بعض غزلیں نظر انداز کر دی گئی ہیں ۔ نسخہ فوجدار ۱۲۳۷ میں لکھا گیا اور نسخہ شیرانی اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۔ غالب کے فیروز پور اور وہاں سے کلکتہ روانہ ہو جانے کے باعث نسخہ شیرانی نا تمام رہا ۔ حاشیے پر البتہ چند غزلوں کے اضافے ہوئے جن میں سے بعض پر ''از باندہ فرستادہ'' لکھا ہوا ہے لیکن متن ہی کے خط میں ۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یاں بیان کیجیے سپاس لذت آزار دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے اب
ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست[۱]

اس میں لفظ ''اب'' خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقطع محبوبہ کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھا گیا، جب مرزا اسد تخلص چھوڑ کر غالب تخلص اختیار کر چکے تھے لیکن جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے محبوبہ غالب کی محبوبیت مرنے سے پہلے غالب کے عشق میں بدل گئی تھی۔ یہ برق تمثال محبوبہ، یہ مطربہ دل نواز، غالب کے ماتم خانے کو اپنی شمع حسن سے منور کرنے لگی تھی اور اب شاعر کی اندھیری راتوں میں صبح تک روشنی رہتی تھی۔

ایک ایسی ہی صبح مسرت کی داستان غالب کی زبان سے سنیے جب وہ اپنی دل نواز محبوبہ کو مخاطب کرتے ہیں۔ انداز تخاطب کی نرمی اور لطافت خاص

۱۔ نسخۂ فوجدار میں تخلص اسد اور شیرانی میں غالب ہے۔ دونوں غزلوں کو ملا کر اشعار کی تعداد سولہ ہے۔ فوجدار کے دو شعر خارج کیے گئے۔ حاشیہ فوجدار اور شیرانی کے اشعار کی تعداد ۱۴ ہے۔ میرے خیال میں نسخۂ شیرانی کے اشعار محبوبہ کی زندگی ہی میں لکھے گئے لیکن آخری شعر یعنی مقطع شیرانی وفات کے بعد جس کی غمازی لفظ ''اب'' کرتا ہے۔ ایسے دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

طور سے توجہ کی مستحق ہے :

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست مخسپ
جہاں جہاں گل نظارہ چیدنست مخسپ

مشام را بہ شمیم گلے نوازش کن
نسیم غالیہ سا در وزیدن ست مخسپ

ز خویش حسن طلب بین و در صبوحی کوش
مے شبانہ ز لب در چکیدنست مخسپ

ستارۂ سحری مژدہ سنج دیدارست
بہ بیں کہ چشم فلک در پریدنست مخسپ

تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم
بہ پشت دست بدنداں گزیدنست مخسپ

نشاط گوش برآواز قلقل ست بیا
پیالہ چشم براہ کشیدنست مخسپ

بذکر مرگ شبی زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ

دیکھا آپ نے؟ غالب نے کس قدر حسین منظر کھینچا ہے اور کس طرح اپنی مست خواب محبوبہ کو جگا رہے ہیں ۔ میری محبوب ! نہ سو ، صبح ہو گئی ہے ، کلیاں کھل رہی ہیں ، ہر طرف حسین نظاروں کے پھول بکھرے ہوئے ہیں ، یہ پھول چن لینے کے قابل ہیں ۔ اپنی مشام جاں کو خوشبوؤں سے معطر کر لو ، نسیم عطر بیزی کر رہی ہے ۔ ذرا اپنی طرف سے حسن طلب تو دیکھو ۔ رات کی شراب ہونٹوں سے ٹپک رہی ہے اور صبوحی طلب ہے ، دیکھو چشم فلک یعنی ستارۂ سحری ''مژدہ سنج دیدار'' ہے ۔ اب وہ رخصت ہو رہا ہے ۔ سنو ! میری محبوب سنو ! تم اپنے خواب ناز میں مست ہو اور سحر ڈوبتے ستاروں پر افسوس کر رہی ہے ۔ مسرت قلقل مینا پر گوش بر آواز ہے اور پیالہ چشم براہ ۔ اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لو ۔ اور اگر تمھیں غالب سے اس کا افسانۂ محبت سننا ہے تو اٹھو گذری ہوئی رات کا دلکش افسانہ سنو ۔

دیکھیے اس غزل میں ، اس جکوری میں ، کتنی تازگی ہے ، کتنی آسودگی ہے اور کتنی کیف انگریزی ! شاید ایسی ہی کسی صبح کی کیفیت اپنی اردو غزل کے اس شعر میں بھی بیان کی ہے ۔ کہتے ہیں :

گل کھلے ، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

اور اب غالب کی زندگی میں وہ دور آ گیا جب وہ مغنئی آتش نفس ، وہ مطربہ رہزن تمکین و ہوش ، وہ بت غالیہ مو اور وہ بانوے مغاں شیوہ خود غالب سے والہانہ اور مجنونانہ محبت کرنے لگی اور بقول غالب انھیں اپنی بے کسی کی داد مل گئی :

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

لیکن یہ والہانہ شیفتگی دیکھ کر خود غالب حیران ہیں اور جب اس کی طرف

سے بے تابانہ اظہار عشق ہونے لگا تو خود ہی سوال کرتے ہیں :

ظالم ! تو و شکایت عشق ؟ این چہ ماجراست !
بارے بمن بگو ، کہ دلت داد خواہ کیست ؟

نیرنگ عشق ، شوکت رعنائی تو برد
در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست ؟

با این ہمہ شکست درستی ادائے اوست
رنگ رخت ، نمونۂ طرف کلاہ کیست ؟

با تو ، بہ پند ، حرف بہ تلخی گناہ من
با من بعشق غلبہ دعوی گناہ کیست ؟

غالب کنون کہ قبلۂ او کوے دلبر است
کے می رسد بدین کہ دلش سجدہ گاہ کیست ؟

الٰہی حیرت ہے کہ جس محبوبہ ، جس ظالم کے فراق میں راتیں تڑپ تڑپ کر گزارتے تھے اب وہی ان کے لیے بے چین ہے ۔ جس سے اظہار محبت کرتے تھے اب اسی کی طرف سے اظہار محبت ہو رہا ہے ۔ وہ تجاہل سے کام لیتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ آخر وہ کون ظالم ہے جس سے تجھے عشق ہوگیا ہے اور وہ کون خوش نصیب ہستی ہے جس سے داد خواہی چاہی جا رہی ہے ؟ بھئی ! یہ عشق کا جادو بھی خوب ہے ، جو حسن سے اس کی ساری شان و شوکت چھین لے گیا اور اب اس کے پاس ناز کے بجائے صرف نیاز رہ گیا ہے ۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کس حسین کی چشم سیاہ ہے جس نے تجھے شکار کر لیا ہے ۔ میں نے نصیحت کی اس قدر بے تابی کا اظہار نہ کرو سب کے سامنے اظہار محبت نہ کرو ہماری محبت کا راز غیروں پر کھل جائے گا ، ہنگامے برپا ہوں گے ۔ میں نے مانا میری باتوں میں تلخی تھی ، مانا کہ اس میں میرا قصور تھا لیکن یہ بھی تو کہو میرے ساتھ اس قدر شدت سے محبت کرنے میں کس کا قصور ہے میرا یا تمہارا ؟ لیکن اس پروانہ وار محبت کرنے والی محبوبہ کے پاس ، جواب میں "یک نگہ ، یک خندۂ دزدیدہ یک تابندہ اشک" کے سوا کچھ نہ تھا ۔ وہ دیوانہ وار آئی ، پروانہ وار اپنی شمع کے گرد گھومتی ہے اور آخرکار اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔

ایک بڑی حسین غزل میں غالب نے اپنی اور اس کی حالت کو بڑے کیف انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے جس کا لفظ لفظ محبت اور مسرت کی غمازی کرتا ہے :

گفتم ، ز شادی نبودم گنجیدن آسان در بغل
تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل

نازم خطر ورزیدنش وان ہرزہ دل لرزیدنش
چینے ببازی بر جبین دستی بدستان در بغل

آہ از تنک پیراہنی کافزون شدش تر دامنی
تاخوی برون داد از حیا گردید عریان در بغل

دانش ہمے در باختہ ، خود را ز من نشناختہ
رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہان در بغل

تا پاس دارد خویش را مے در گریبان ریختی
خستی چو رفتی زان میش گل از گریبان در بغل

گاہم بہ پہلو خفتہ خوش ، بستی لب از حرف و سخن
گاہم ببازو ماندہ سر ، سودی زنخدان در بغل

نا خواندہ آمد صبح گہ بند قبایش بے گرہ
و اندر طلب منشور شہ نکشودہ عنوان در بغل

مے خوردہ در بستان سرا ، مستانہ گشتی سوبسو
خود سایۂ او را ازو صد باغ و بستان در بغل

چون غنچہ دیدی در چمن گفتی بہ گلبن کت زمن
چون رفتہ ناوک از جگر چون ماندہ پیکان در بغل

ہان غالب خلوت نشین بیمے چنان عیشے چنین
جاسوس سلطان در کمین مطلوب سلطان در بغل

کہتے ہیں میں نے اپنی محبوبہ سے کہا کہ میں اس قدر خوش ہوں کہ مسرت کے باعث کسی کے پہلو میں نہیں سما سکتا ۔ یہ سن کر میری بھولی محبوبہ نے انتہائی بھولے پن سے مجھے خوب بھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا ۔ مجھے فخر ہے کہ وہ خطرات کی پروا نہیں کرتی اگرچہ اس کا دل لرزتا رہتا ہے ۔ وہ مجھے چھیڑنے کے لیے شرارت سے تیوریوں پر بل ڈالتی ہے اور حیلہ جوی سے بغلوں میں ہاتھ چھپا لیتی ہے ۔ آہ وہ اس کا نازک اور باریک لباس جس کے باعث تر دامنی میں اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ پہلو میں عریاں ہوئی تو شرم سے پسینہ میں شرابور ہو گئی ۔ میری محبوبہ جب میرے پاس آئی تو نشے میں چور تھی ، ہوش و حواس گم تھے ۔ اس وقت وہ مجھ میں اور اپنے آپ میں امتیاز نہ کر سکتی تھی ۔ اس نے اپنا چہرہ شرم سے میری آغوش میں چھپا لیا ۔ اس کی عجیب حالت تھی ۔ کبھی ہوشیار رہنے کے لیے گریبان میں شراب انڈیل لیتی اور کبھی نشے سے مدہوش ہو کر اس کی حالت ایسی ہو جاتی تھی جیسے مسلے جانے پر پھول کی حالت ہو جاتی ہے ۔

کبھی وہ انتہائی مستی اور سرور کے عالم میں مطمئن اور آسودہ ، میرے پہلو میں لپٹ جاتی اور زبان سے ایک حرف نہ نکالتی ، کبھی میرے بازو پر سر رکھتی اور کبھی اپنے زنخدان کو میری بغل میں ملتی تھی -

اور اب غالب ایک عجیب و غریب واقعہ کا انکشاف کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی محبوبہ ، ستم پیشہ ڈومنی ، بتِ مغاں شیوہ ، رہزن تمکین و ہوش مطربہ کی رسائی شاہی محفلوں تک تھی - کہتے ہیں کہ ایک روز صبح صبح میری محبوبہ میرے پاس آئی - اس کی قبا کے بند کھلے ہوئے تھے - بغل میں بادشاہ کی طرف سے طلبی نامہ تھا لیکن ان کھلا - غالب اسے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں "جاسوس سلطان" کا خیال آتا ہے ؛ بدنامی کا اندیشہ ہے ، بادشاہ کے عتاب کا خوف ہے ، مطلوب سلطان یعنی اپنی محبوبہ کا بھی خیال ہے - "ہم چناں عیش چنیں" سے دو متضاد کیفیات کا اظہار ہوتا ہے جس میں خوف کے ساتھ احساس فخر بھی ہے اور مسرت بھی کہ اس نے مجھے بادشاہ پر ترجیح دی ہے -

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کون تھا جس کی مطلوب یہ ستم پیشہ ڈومنی اور یہ مطربہٗ دل نواز تھی جس کے لیے شاہی جاسوس لگے رہتے تھے ؟

دہلی کے تخت پر ۱۸۰۶/۱۲۲۱ سے ۱۸۳۷/۱۲۵۳ تک ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ (ثانی) متمکن رہے[۱۲]- غالب کی محبت اسی دور میں پروان چڑھی - بادشاہ کی عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب تھی - دربار پر ڈوم ڈھاری اور خواجہ سرا قابض ہو چکے تھے - شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب کا ہنگامہ برپا رہتا تھا جس میں غالباً اس نوجوان مطربہٗ شیریں ادا کو بھی طلب کیا جاتا تھا -

بہر حال غالب کی زندگی کا یہ بہترین دور تھا جب اُن کی محبوبہ اُن کے ہمسائے میں رہتی تھی - جب اُن کی کامرانی اور شادمانی کا دور تھا اور جب اُنھیں بقول ان کے فکرِ دنیا میں سر نہیں کھپانا پڑتا تھا اور بقول ان کے یہ وہ زمانہ تھا جب :

اُدھر متھرا داس سے قرض لیا ، اُدھر درباری مل کو جا مارا ، اِدھر خوب چند نین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی - ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود ، شہد لگاؤ چاٹو ، نہ مول نہ سود - اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بھوپی کے سر - بایںہمہ کبھی خان (احمد بخش) نے کچھ دے دیا ، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا ، کبھی ماں نے آگرے سے کچھ بھیج دیا[۱۳]-"

۱۲- اکبر شاہ ثانی : تاریخ پیدایش ے رمضان - ۱۷۵۱/۱۱۷۳ -

۱۳- خط بنام علائی ، مورخہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ - اُردوے معلی (۱۸۶۹)

دن عید اور رات شب برات تھی ، ایک والہانہ محبت اور مسرت کا دور۔ عیش بافراغت کے مزے تھے لیکن مسرت کی لافانی ساعتیں بھی غم جدائی اور الم فراق میں بدل جاتی ہیں ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ مغنی' آتش نفس ، یہ عشق پیشہ محبوبہ ، اپنے محبوب (غالب) سے مل نہیں سکتی راستہ میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں ۔ غالب شادی شدہ ہیں ایک ''معزز'' گھرانے میں ان کی شادی ہوئی ہے ۔ (حالانکہ اس دور میں اس طبقہ کی ہوس کاریاں عام تھیں) ۔ محبوبہ ''مطلوب سلطان'' ہے ، کوتوال شہر کا بھی خوف ہے اور ''جاسوس سلطان'' کا بھی ۔ کھل کر ملاقات نہیں ہو سکتی ، چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی ہیں ۔ غالب اپنی محبوبہ کی اس قلبی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں :

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل
درد جدائی اسد اللہ خان نہ پوچھ

آپ فعل کی تذکیر کے بارے میں نہ سوچیے ۔ یہ تو غزل کی روایتی زبان ہے ، جس میں غالب ایک واقعہ بیان کر رہے ہیں جس سے ان کی محبوبہ کی دلی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ محبت کے دن اور محبت کی راتیں اس طرح مسرت اور الم کے درمیان گزر رہی تھیں ۔ اس محبت کے چرچے ہونے لگے تھے کہ ایک رات ، معلوم نہیں کیا واقعات پیش آئے ، کون سے انکشافات ہوئے ، کیسے ہنگامے برپا ہوئے ، کن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ، لوگوں نے کیا کہا اور کیا کیا کہ ''یہ مہتاب شب جمعہ' ماہ رمضان'' یہ محبوبہ' غالب نواز ، ''شرم رسوائی'' اور الفت کی پردہ داری کرنے کے لیے نقاب خاک میں جا کر چھپ گئی اور غالب کی نظر میں دنیا تاریک ہو گئی ، زندگی بے معنی ہو گئی ، آنکھوں سے جوئے خون بہنے لگی جس میں قلم ڈبو کر غالب نے ایک مرثیہ لکھا ۔

آج غالب کی محبوبہ اور اس کے بعد وہ خود بھی دنیا سے رخصت ہو کر پیوند زمین ہو چکے ہیں لیکن یہ دردناک داستان محبت ابھی تک ان کی کلیات میں محفوظ ہے :

سر چشمہ' خون است ز دل تا بہ زبان ہائے
دارم سخنی با تو و گفتن نتوان ہائے

سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویان
نظارہ بود شبنم و دل ریگ روان ہائے

ذوقیست درین مویہ کہ بر نعش منتش
با دل شدۂ ہیچ مگوے ہمہ دان ہائے

در خلوت تابوت نرفتست ز یادم
بر تختہ در دوختہ چشم نگران ہاے

اے فتوی ناکامی مستان کہ تو باشی
مہتاب شب جمعہ ماہ رمضان ہاے

باد آور ناگفتہ شنو رفت حوالت
دردے کہ بگفتن نہ پزیرفت گران ہاے

از جنت و از چشمہ کوثر چہ کشاید
خون گشتہ دل و دیدۂ خوں نابہ فشان ہاے

در زمزمہ از پردۂ و ہنجار گزشتیم
رامشگری شوق بہ آہنگ فغان ہاے

سیماب تنی کز رم برق ست نہادش
گردیدہ مرا مایہ آرامش جان ہاے

غالب بدل آویز کہ در کارگہ شوق
نقشی ست درین پردہ بصد پردہ نہان ہاے

لیکن یہ داستان محبت ، محبوبہ کا یہ مرثیہ ، غالب نے فارسی ہی میں نہیں اردو میں بھی ہمارے لیے محفوظ کر دیا ہے ۔ چنانچہ اسے نسخہ فوجدار محمد خان اور شیرانی سے نقل کیا جاتا ہے ۔ دیکھیے تو اس سے کیسے کیسے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس خفیہ محبت کا راز آشکارا ہو گیا تھا ۔ شاہی سزا کا خطرہ اس کے لیے بھی تھا اور اس کے محبوب غالب کے لیے بھی ۔ اس لیے عشق نے حسن کے لیے قربانی دی اور غالب کی محبوبہ نقاب خاک میں پناہ لے کر اپنی محبت کے انمٹ نشان چھوڑ گئی ۔ ملاحظہ ہو غالب نے اس کی وفات پر اپنے احساسات کس طرح پیش کیے ہیں :

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے !
کیا ہوئی ظالم ! تری غفلت شعاری ہائے ہائے !

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہاے ہاے !

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی ، میری دوستداری ہاے ہاے !

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہاے ہاے !

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!
گلفشانیہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تری لالہ کاری ہائے ہائے!
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے!
خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے!
کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تار برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!
گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ نا اُمید واری ہائے ہائے!
گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے **اسد**
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے!

حاتم علی مہر کو اسی محبوبہ عشق پرور کے بارے میں "چنا جان نہ سہی منا جان سہی"[۱۴] لکھ کر تفریحی پیرائے میں مہر کا غم غلط کرنا اور غم دوست کو فراموش کرانا مقصود تھا ۔ ورنہ اس نظم کا ایک ایک لفظ اس درد کی ترجمانی کر رہا ہے جو غالب کے دل کو تڑپا رہا تھا اور جس کے باعث ان کا جی اس زمانے میں زندگی سے بھی بیزار ہو گیا تھا ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

مجھ سے مت کہہ ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا!
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے نا چار ہے

غالب کی داستان محبت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے اپنی غزلوں میں کہیں تو اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور کہیں اپنی محبوبہ کے جذبات کی ، اسی قسم کی ایک غزل میں محبوبہ سے اس کی درد بھری داستان سنیے ۔

بیا و جوش تمنائے دیدنم ، بنگر چو اشک ، از سر مژگاں چکیدنم بنگر

۱۴- اُردوے معلیٰ : بنام حاتم علی مہر ۔

ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر
گزشتہ کار من از رشک غیرشرمت باد — بہ بزم امن تو خود را ندیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیان گہ شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
نیازمندیٔ حسرت کشان نمی دانی — نگاہ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
اگر ہوائے تماشائے گلستان داری — بیا و عالم در خون تپیدن بنگر
بداد من نہ رسیدی ز درد جان دادم — بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر

اے میرے محبوب ! آ اور دیکھ کہ تجھے دیکھنے کی مجھے کس قدر تمنا ہے اور میں تیرے فراق میں کس طرح آنسو بہا رہی ہوں ۔

ہاں میں تیرے فراق میں تڑپتی تھی ۔ یہی میرا جرم تھا جس کے باعث تو نے علیحدگی اختیار کر لی تھی ۔ آ میری قبر پر آ اور دیکھ کہ میں کس طرح آرام کر رہی ہوں ۔

اب میرے دل میں تیرے لیے کسی سے رشک کی گنجائش نہیں رہی ۔ میں تیری بزم عیش سے کنارہ کش ہو چکی ہوں ، اب کوئی ہنگامہ نہیں ۔ امن ہی امن ہے تجھے شرم آنی چاہیے ۔

ذرا ایک نظر ادھر بھی تو دیکھ ۔ دانا اگا ، بڑہا اور آشیانہ بھی تیار ہو گیا ۔ دیکھ میں نے ہما کے انتظار میں کس طرح جال بچھا رکھا ہے ۔

غالباً تو حسرت کشوں کی نیازمندی سے واقف نہیں ۔ ذرا میری نگاہ بن کر چور نظروں سے دیکھنا سیکھ اور یہ معلوم کر کہ میں تیری طرف کس طرح دیکھتی رہتی ہوں ۔ اگر تجھے تماشائے گلستان دیکھنے کی ہوس ہے تو آ اور میرے خون میں تڑپنے کا نظارہ کر ۔

میں نے تیری محبت کے درد سے جان دے دی اور تو میری فریاد کو نہ پہنچا ۔ آ اور ذرا اسے بھی دیکھ لے کہ میں نے تیرے طرز تغافل کی داد کس طرح دی ہے ۔

اپنی یہ کیفیت اپنے محبوب غالب کو دکھانے کے بعد ایک بار اپنے محبوب کو " بیتے ہوئے دن عیش کے " یاد دلاتی ہے ۔ ابتدائے عشق کا وہ زمانہ جب وہ غالب سے دیوانہ وار محبت کرنے لگی تھی ، جب غالب کو زبان خلق کا خوف تھا اور اُسے پروائے ننگ و نام نہ رہی تھی ۔

اس کی موت پر شہر میں اور شہر کے لوگوں پر کیا گزری ۔ اسی کی زبان سے سنیے ۔

بمرگ من کہ پس از من ز مرگ من یاد آر
بکوے خویشتن آن نعش بے کفن یاد آر

من آن نیم کہ ز مرگم جہان ہمہ نہ خورد
فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر

ببام و در ز ہجوم جوان و پیر بگوی
بکوی و برزن اندوہ مرد و زن یاد آر

بہ ساز نالہ گروہی ز اہل دل دریاب
بہ بند مرثیہ جمعی ز اہل فن یاد آر

ملال خلق و نشاط رقیب در ہمہ حال
غریو خویش بہ تحسین تیغ زن یاد آر

بخود شمار وفا ہاے من ، ز مردم پرس
بمن حساب جفا ہاے خویشتن یاد آر

چو دید جان من از چشم پر خمار بگوی
چہ رفت بر سرم از زلف پرشکن یاد آر

خروش و زاریٔ من در سیاہی شب زلف
دم فتادن دل در چہ ذقن یاد آر

بسنج تا ز تو برمن دران محل چہ گزشت
نخواندہ آمدن من در انجمن یاد آر

ز من پس از دو سہ تسلیم یک نگہ وانگہ
ز خود پس از دو سہ دشنام یک سخن یاد آر

اے میرے محبوب ! میری جان کی قسم ! اگر میرے مرنے کے بعد تو مجھے یاد کرے تو اپنی گلی میں میری نعش بے کفن کا خیال کر !

میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی موت پر دنیا میں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو ۔ اس لیے یاد کر کہ میرے مرنے پر شیخ و برہمن نے کس طرح آہ و زاری کی تھی ۔

بام و در پر نوجوانوں اور بوڑھوں کے ہجوم کا تصور کر اور گلی کوچوں میں عورتوں اور مردوں کا اندوہ یاد کر ، جو میری موت کی خبر سن کر نکل آئے تھے ۔

پھر اس منظر کو بھی یاد کر جب اہل دل آہ و زاری کر رہے تھے اور اہل فن مرثیے سنا رہے تھے ۔

خلق غمگین تھی ، دشمن خوش تھے اور ہاں تیغ زن کی شمشیر زنی پر اپنا نعرۂ تحسین بلند کرنا بھی یاد کر ۔

اپنے ساتھ میری وفاؤں کا شمار کر ، اس کے بعد لوگوں سے پوچھ اور اس

کے ساتھ ہی ذرا اپنی جفاؤں کا بھی تو شمار کر لے ۔

میری روح نے تیری مخمور آنکھوں میں کیا دیکھا اور مجھ پر تیری زلف پر شکن نے کیا قیامت ڈھائی ؟ ذرا اسے بھی تو یاد کر لے ، جب میرا دل تیری محبت میں گرفتار ہوا تھا ۔

اور ہاں ! راتوں میں ذرا میری آہ و زاری بھی تو یاد کر اور یہ بھی یاد کر کہ تیرے فراق میں مجھ پر کیا گزرتی تھی ۔

اور یہ بھی تو یاد کر کہ ایک مرتبہ میں تیری محفل میں بے بلائے آ گئی تھی تو 'تو نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا ، تو نے میرے دو تین بار سلام کرنے پر ایک مرتبہ اچٹتی نگاہ سے دیکھا تھا اور دو تین بار برا بھلا کہنے کے بعد ایک بات کی تھی ۔

اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حسینہ کی موت معمولی لوگوں کی سی موت نہ تھی ، شہر میں اس کی موت سے ہنگامہ برپا ہو گیا تھا ، شیخ و برہمن سب ہی کو صدمہ پہنچا تھا کیونکہ یہ ایسی حسینہ کی موت تھی جو خود حسن پرست تھی ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جنازہ غالب کی گلی سے گزرا تھا جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مکان غالب کی قیام گاہ سے بہت زیادہ دور نہ تھا[۱۵] ۔

اس شکایت نامے کے بعد غالب کی وہ غزل بھی ملاحظہ ہو جو محبوبہ کی زبان سے اس کی وفات کے بعد کہلوائی گئی ہے اور جس میں محبوبہ کہتی ہے کہ اب میرے بعد حسن کا کوئی قدردان نہ رہا ۔ ساقی بار بار ''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق'' کی صدائیں مختلف لہجوں میں دیتا ہے لیکن ہاں کہنے اور میری طرح عشق کا ساغر کش بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ۔ غزل میں روایتی انداز ہونے کے باوجود ذرا اس کا لہجہ اور اس کی روح ملاحظہ ہوں :

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولئی انداز و ادا میرے بعد

۱۵۔ نسخۂ فوجدار کا یہ شعر لائق توجہ ہے :

طلسم مستی دل آنسوئے ہجوم سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

در خورِ عرض نہیں جوہر بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیاہ[۱۶]
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد[۱۷]

شاید حسب ذیل شعر بھی اسی حادثے کی ترجمانی کرتا ہے:

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہوگئے

قیاس کہتا ہے کہ شعر میں محبوبہ کے نام کے بجائے اسد تخلص داخل کر دیا گیا ہے اور یوں بھی عشق کی موت میں حسن کی موت بھی تو پنہاں ہوتی ہے۔ اس

۱۶- اس سلسلے میں '' نخوانده آمدن من در انجمن یار آر '' والی غزل ملحوظ رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حسینہ شمع محفل احباب بھی ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح دیکھیے '' خاصه بر صدر نشینے که به پہلوے تو بود '' والی غزل بھی۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گلدستۂ احباب کا ایک پھول مومن خاں بھی تھے۔

۱۷- غزل کی یہ شکل نسخۂ شیرانی سے لی گئی ہے۔

کی موت کے بعد یوں بھی اب خود ہی محبوبہ کی طرف سے شکایت کرتا اور خود ہی جواب دیتا تھا ، افسوس کرتا تھا ، شرمندہ ہوتا اور یاد کرتا تھا ۔ چنانچہ کئی سال بعد کلکتہ جاتے ہوئے ایک غزل میں جو باندے سے دہلی بھیجی گئی تھی کبھی کہتے ہیں کہ ''رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے'' اور کبھی ''انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں'' کا نعرہ لگاتے ہیں :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

اور کبھی اپنی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں :

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

ڈھونڈے ہے اس ''مغنّی آتش نفس'' کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

بیادِ گرمئی صحبت برنگ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

یا پھر پکار اُٹھتے ہیں :

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ! وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں !
تھی وہ ''اک شخص'' کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں !

کبھی آسمان کی طرف نظر اُٹھتی ہے تو وہی مطربۂ شیریں ادا ، وہی مغنی آتش نفس اور وہی رہزن تمکین و ہوش اور اس کا دیکھتے دیکھتے نظروں سے چھپ جانا یاد آتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اور کبھی عالم خیال میں اسے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں :

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ذہن پر گزرے ہوئے مسرت انگیز لمحوں کی تصویریں اُبھر آتی ہیں ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی ہے کبھی انتظار کی بے تاب گھڑیاں یاد آتی ہیں اور

کبھی محبوبہ کی عشوہ طرازیاں ، کبھی آنے کی خبر پا کر مسرت سے پھول کی طرح کھل جانا یاد آتا ہے اور کبھی خود اپنی طرف سے شرارتیں اور جھگڑے یاد آتے ہیں ۔ ان دلکش ، طرب انگیز اور الم خیز لمحوں کو یاد کرکے شاعر بےساختہ پکار اُٹھتا ہے :

رفت آنکہ کسب بوے تو از باد کرد می
گل دید می و روئے ترا یاد کرد می

رفت آنکہ گر براہ تو جاں داد می ز ذوق
از موج گرد رہ نفس ایجاد کردمی

رفت آنکہ گرلبت نہ بہ نفریں نواختی
رنجیدمی و عربدہ آغاز کردمی

رفت آنکہ قیس را بسترگی ستودمی
در چابکی ستایش فرہاد کردمی

رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمی
در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمی

رفت آنکہ در اداے سپاس پیام تو
ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمی

اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمی

بندم منہ ز طرہ کہ تابم نماندہ است
رفت آنکہ خویش را بہ بلا شاد کردمی

آخر بداد گاہ دگر اوفتاد کار
رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کرد می

غالب ہواے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کرد می[۱۸]

ہائے وہ زمانہ جب ہواؤں میں تیری خوشبو سونگھتا اور پھولوں کو دیکھ کر تیری صورت یاد کرتا تھا ۔

۱۸- خلخ : دریائے سیحوں کے پار ترکوں کا ایک قبیلہ ۔ پرانے شعرا اس کے حسن و جمال کے معترف تھے ، یہ لوگ خرلج اور قرلق بھی کہلاتے تھے ۔
نوشاد : ایک شہر یا بتکدہ ، فرہنگ عمید ، تہران ۔

ہائے وہ زمانہ جب ذوق و شوق کے عالم میں اگر تیری راہ میں جان دیتا تو گرد راہ کی موجیں نئی زندگی بخشتی تھیں !

ہائے وہ زمانہ جب تو مجھے برا بھلا نہ کہتی تو تجھ پر ناراض ہوتا اور جھگڑتا تھا کہ آج تو خاموش کیوں ہے ، آج مجھ پر خفگی کیوں نہیں ؟

ہائے وہ زمانہ جب میں اپنے مقابلے میں قیس کی تنومندی کی تعریف اور فرہاد کی چابک دستی پر اس کی ستایش کرتا تھا ۔

ہائے وہ زمانہ جب تیرا روے زیبا اور قد و قامت دیکھ کر گل و شمشاد کے بارے میں بحثیں کرتا اور انھیں بے حقیقت قرار دیتا ۔

ہائے وہ زمانہ کہ تیرا پیغام آتا تو اس خوشی میں پنجروں میں بند سینکڑوں پرندوں کو رہا کر دیتا تھا ۔

لیکن آہ آج زمانہ بدلا ہوا ہے ، آج تو تیری وفائیں یاد کرکے دکھ ہوتا ہے ۔ ہائے وہ زمانہ ! جب میں تیری جفاؤں پر فریاد کرتا تھا ۔

مجھے اب اپنے طرہ کی ڈوریوں سے نہ باندھ کہ اب مجھ میں تاب و تواں باقی نہیں رہی ۔ ہائے اب وہ زمانہ نہیں جب مجھے تکلیفیں اٹھانے میں بھی لطف آتا تھا ۔

ہائے وہ زمانہ جب میں تیرے ظلم و ستم کے شکوے کرتا تھا ، اب تو میرا معاملہ دوسرے ہی داد گر (خدا) سے ہے جس سے تیری جدائی کی شکایت کرتا اور اُسی سے انصاف طلب کرتا ہوں ۔

آخر میں کہتے ہیں اے غالب ! اب میرا جی اس دنیا ہی سے بیزار ہو گیا ہے ۔ بے عشق زندگی بیکار ہے ۔ دل چاہتا ہے کعبے کو چلا جاؤں اور وہاں خدا کے گھر میں خدا سے فریاد کروں ۔ ہاے وہ زمانہ جب میرا جی چاہتا تھا کہ خلخ اور نوشاد کے حسینوں سے تیرے حسن کا مقابلہ کروں ۔

غالب کی یہ دلکش ، حسین اور غم انگیز یادیں اسے ہمیشہ تڑپاتی رہیں ۔ اپنی محبوبہ کی وفائیں اور والہانہ محبت کی یاد اسے ہمیشہ ستاتی رہی اور وہ زندگی بھر اپنی قلبی کیفیتوں کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا رہا :

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا ، یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا رہگزر یاد آیا

کبھی عرض نیاز عشق کے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنی محبوبہ کی کمی محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب میرے پاس وہ دل ہی نہیں جس پر مجھے ناز تھا اور جس کے باعث میں اپنی محبوبہ کی خدمت میں عرض نیاز عشق کر سکتا تھا :

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ہر چند ہوں میں طوطیٔ شیریں سخن و لے
آئینہ آہ میرے مقابل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ ، در خور محفل نہیں رہا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہوں قطرہ زن بوادی وحشت شبانہ روز
جز تار اشک جادۂ منزل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

محبوبہ کی زندگی میں انتظار کی راتیں تھیں ، وصل کی راتیں تھیں ، اضطراب کی راتیں تھیں ، مسرت کی راتیں تھیں ، لیکن اب صرف یادوں کی راتیں رہ گئی تھیں جن میں ہجر کا سا اضطراب تھا ، لیکن وصل کی امید باقی نہ رہی تھی۔ ایسی ہی ایک رات کی کیفیت غالب نے دو غزلوں میں بیان کی ہے :

(۱)

رات ، دل ، گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
رنگ روئے شمع ، برقِ خرمنِ پروانہ تھا

شب کہ تھی کیفیت محفل بیاد روئے یار
ہر نظر ، داغِ مے خالِ لبِ پیمانہ تھا

درد کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا
دیکھ اس کے ساعد سیمین و روے پر نگار
شاخِ گل جلتی تھی ، مثل شمع گل پروانہ تھا
اے اسد رویا جو دشت غم میں میں حیرت زدہ
آئینہ خانہ ہجوم اشک سے پروانہ تھا

(۲)

بسکہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاک موج سیل تا پیراہن دیوانہ تھا
شب تری تاثیر سحر شعلہٗ آواز سے
تار شمع آہنگ مضراب پر پروانہ تھا
انتظار جلوۂ کا کل میں ، ہر شمشاد باغ
صورت مژگان عاشق ، صرف عرض شانہ تھا
جوش بے کیفیتی ہے اضطراب آرا اسد
ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا

ایسی ہی ایک رات کی داستان ایک اور غزل میں ملاحظہ ہو جس سے محبوبہ کی وفات کے بعد غالب کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جس سے وہ اس وقت گزر رہے تھے :

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتہٗ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا
حاصل اُلفت نہ دیکھا جز شکست آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک لب افسوس تھا
پوچھ مت بیماریٗ غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خونِ دل بے منت کیموس تھا
مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرت پابوس تھا
کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشہٗ غم خانہ میں
دست برسر ، سر بزانوے دل مایوس تھا

زمانہ ایک مسکن مرہم ہے ، وقت گزرنے کے ساتھ زخم مندمل ہونے لگتے ہیں ۔ سوزش میں شدت نہیں رہتی لیکن ”احباب چارہ سازی وحشت“ نہیں

کر سکتے ۔ دل کا درد نہیں جاتا ۔ کبھی نہ کبھی ٹیسیں اٹھتی ہی رہتی ہیں ۔ بھلانے کی کوشش کرنے پر بھی بعض صورتیں بھلائی نہیں جا سکتیں ۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا ، سننا بولنا اور نہ جانے کیا کچھ یاد آتا رہتا ہے ۔ چنانچہ مدتوں بعد ۱۸۵۲ء میں پچپن سال کی عمر میں ، غالب نے ایک غزل لکھی ۔ اس میں بھی اسی محبوبہ اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دن ، درباری شاعری اور روایتی پردوں کے باوجود ، نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ جب غالب ایک مسرت انگیز دور سے گزر رہے تھے ۔ ملاحظہ ہو :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل لکھتے وقت غالب کے ذہن میں اپنی معاشی اور سماجی پریشانیوں کے باوجود اپنی بت مغاں شیوہ ، اپنی مطربۂ شیریں ادا ، رہزنِ تمکین و ہوش اور ستم پیشہ محبوبہ نہ تھی ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں ، جو اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی تھیں ، وہی بزم آرائیاں نہ تھیں جو اپنی محبوبہ کے ساتھ گزری تھیں ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ شام فراق میں اس کی آنکھوں سے جوئے خون نہ بہی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی محبوبہ کی سیاہ زلفیں نہ تھیں جو غالب کے شانوں پر پریشان ہو کر غالب کے مشام جاں کو معطر کرکے ایسے سکون بخش نیند عطا کرتی تھیں اور اندھیری راتوں کو حسین ، دلکش اور مسرت انگیز راتوں میں تبدیل کر دیتی تھیں ؟

لیکن انسان زندگی بھر آنسو نہیں بہا سکتا ، عشق فعل دماغ ہی سہی لیکن

زندگی بھر آنسو بہانا ایک جسمانی بیماری ہے ۔ زندگی کے ہمہمے بڑے سے بڑے غموں پر بھی بھول کے دبیز پردے ڈال دیتے ہیں ۔ دوست ، ہمدرد اور عزیز نصیحتیں کرتے ہیں اور صحت مند انسان اگرچہ بیتے ہوئے دنوں کی حسین یادوں کو فراموش نہیں کرتا لیکن آنسو بہنا بند ہو جاتے ہیں ، سرد آہیں عام بات چیت میں بدل جاتی ہیں ۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

ایک مرشد کامل نے ہم کو نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں ، ہم مانع فسق و فجور نہیں ، پیو ، کھاؤ ، مزے اڑاؤ ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو ، شہد کی مکھی نہ بنو ۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے ۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے ۔ کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی ، آزادی کا شکر بجا لاؤ ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی . . . ۔''

غالباً اس مرشد کامل ہی کی نصیحت سے متاثر ہو کر غالب نے یہ شعر کہا تھا :

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

نسخہ فوجدار محمد خاں کی ایک غزل کے حسب ذیل شعر شاعر کی اس ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں جو '' مرشد کامل '' کی نصیحت کے بعد ہوئی ۔ اس غزل کے اشعار خود محبوبہ کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں :

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

مے پرستاں خم مے منہ سے لگا لو یعنی
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب نے خم مے منہ سے لگایا ، غم کو غلط کیا ، اک گونہ بے خودی چاہی ۔ نہ صرف اپنے غم کو غلط کیا بلکہ مظفر حسین خاں وغیرہ کے غموں کو

بھی اور ''چنا جان نہ سہی منا جان سہی'' کہہ کر حاتم علی مہر کے غم کو بھی غلط کرنے کی کوشش کی ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کے دل میں محبت کی کسک باقی تھی اور ان کی محبت ہنگامی نہ تھی۔ لیکن یہ مرشد کامل کون تھے ؟ میاں کالے ؟ حسام‌الدین حیدر خاں نامی[۱۹] اور خود غالب کی صحت مند فکر ؟ اس محبوبہ کا نام کیا تھا ؟ اختر ؟ ناہید ؟ یا کوئی اور ؟

غالب کی داستان حیات اور اس کی پروانہ وار محبت کرنے والی محبوبہ کے بارے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن ٹھوس دلائل فراہم ہونے تک ''مرشد کامل'' اور محبوبہ کے نام سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا[۲۰]۔ قیاس کے گھوڑے اگرچہ بعض شواہد کی بناء پر ضرور دوڑائے جا سکتے ہیں لیکن قیاس کے گھوڑے ہمیشہ منزل تک نہیں پہنچاتے :

کچھ اور چاہیے اثبات ادعا کے لیے

۱۹۔ چو حرز بازوے ایمان نویسم حسام الدین حیدر خاں نویسم

۲۰۔ مجھے یقین ہے کہ غالب کو طرز بیدل سے ہٹانے میں نہ '' سخنوران جاہل'' کا اتنا حصہ تھا اور نہ ''سخنوران کامل'' کا بلکہ یہ غالب کا عشق تھا اور اس کی محبوبہ جس نے آسان گوئی کی طرف غالب کی رہنمائی کی اور اسداللہ خاں کو غالب نام آور بنا دیا۔

غالب کی مثنوی درد و داغ

محمد عبداللہ قریشی*

غالب نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے ۔ ہر صنف سخن میں اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں ۔ غزل ہو یا قصیدہ ، مثنوی ہو یا رباعی ، قطعہ ہو یا مرثیہ ، ہر میدان میں اپنے کمالِ فن کے جھنڈے گاڑے ہیں ۔ بقول مولانا حالی : ''ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا ، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا ، نثر میں تینوں سے بالا تر ہے . . . . یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا اور چونکہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے ، اس لیے آیندہ بھی یہ اُمید نہیں کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے ۔''[1]

غالب نے اگرچہ رومی ، نظامی ، خسرو یا فیضی کی طرح کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی مگر ان کے فارسی کلیات میں چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں موجود ہیں جن میں سب سے بڑی ۱۰۹۸ بیت کی اور سب سے چھوٹی ۳۳ بیت کی ہے ۔ یہ مثنویاں مختلف موضوعات پر ہیں ۔ دو مثنویاں بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ، ایک ولی عہد بہادر شاہ کی شان میں ، دو تقریظ کے طور پر ، ایک شہر بنارس کی تعریف میں ، ایک اہل کلکتہ کے اعتراضات کے جواب میں ، ایک اسلامی مسائل کی تشریح میں ، دو اخلاق اور ایک نامکمل صورت میں ہے ۔ ان میں سرمۂ بینش ، درد و داغ ، رنگ و بُو ، چراغ دیر ، باد مخالف ، ابر گہر بار اور امتناع نظیر خاتم النبیین وغیرہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں ۔

مثنوی لفظ مثنٰی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''دو'' چونکہ اس کے ہر بیت میں دو ہموزن قافیے ہوتے ہیں ، اس لیے اسے مثنوی کہتے ہیں ۔ یہ صنف

* محمد عبداللہ قریشی ۔ مدیر ادبی دنیا ، لاہور ۔

۱۔ یادگار غالب (لاہور ، ۱۹۶۳ء) ، ۵۸۸-۵۸۹ ۔

اہل ایران کی ایجاد ہے اور انھی کی سرپرستی میں یہ پھلی پھولی اور اس نے ارتقا کی منزلیں طے کیں ۔ تمام انواعِ شاعری اور اصناف سخن میں یہی ایک چیز ہے جو سب سے زیادہ مفید اور ہمہ گیر ہے ۔ مظاہر قدرت کی عکاسی اس کا معمولی کرشمہ ، جذبات انسانی کی ترجمانی اس کا ادنیٰ وصف اور تخیل کی صورت گری اس کی چھوٹی سی کراست ہے ۔ تاریخی حالات ہوں یا فرضی افسانے ، زندگی کا معاشرتی پہلو ہو یا اقتصادی رُخ ، عشق و محبت کی داستانیں ہوں یا جنگ و جدل کے واقعات ، سب اس کے ذریعے بیان کیے جا سکتے ہیں :

قسمت بادہ باندازۂ جام است این جا

یوں تو غالب کی ہر مثنوی جدتِ اسلوب ، علو تخیل ، تسلسلِ بیان ، حسنِ ترتیب اور پختگیٔ کلام کی منہ بولتی تصویر ہے اور فارسی زبان میں خاص درجہ رکھتی ہے مگر میں صرف ایک مختصر سی مثنوی کا تعارف کرانا چاہتا ہوں ۔ اسی سے باقی مثنویوں کا اندازہ ہو جائے گا ۔ اس مثنوی کا نام ''درد و داغ''[1] ہے ۔ اس میں غالب نے ۱۸۸ بیت میں ایک نہایت دل چسپ قصہ بیان کر کے یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے ۔ اندازۂ قدرت بدلا نہیں جا سکتا ۔ نگاہِ مردِ مومن سے تقدیر راہ پر تو آ جاتی ہے مگر ہمت عالی نہ ہو اور موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے تو برگشتہ نصیبی پھر آڑے آتی ہے اور انسان کی ہر تدبیر الٹی ہو جاتی ہے ۔

قصہ مجمل طور پر یوں ہے کہ کسی جگہ ایک سنار رہتا تھا ۔ وہ تقدیر کا پٹیا تھا ۔ سونا اس کے ہاتھ میں آ کر مٹی ہو جاتا تھا ۔ تنگ دستی نے اس کا بُرا حال کر رکھا تھا ۔ فاقوں تک نوبت آ گئی تھی ۔ بوڑھے والدین کا بوجھ بھی اس کے کندھوں پر تھا ۔ وہ بہتیری دوڑ دھوپ کرتا ، ہاتھ نہ کھلتا ۔ جب افلاس کے ہاتھوں عرصۂ حیات اس پر بالکل تنگ ہو گیا تو وہ قسمت آزمائی کے لیے اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا اور اس نے کسی دوسرے مقام کا رخ کیا ۔

بے سر و سامانی ، راستے کی دشواری اور سفر کی صعوبت نے اس مختصر سے قافلے کو اور بھی پریشان کیا ۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے ، دھوپ کی گرمی اور پیاس کی شدت نے ان کو بے حال کر دیا ۔ اسی بے بسی اور فلاکت زدگی میں وہ پانی تلاش کرتے کرتے ایک صاحب دل صوفی کے تکیے میں پہنچے ۔ پانی پیا اور تازہ دم ہونے کے بعد انھوں نے اپنی داستان غربت و افلاس اس بزرگ کو سنائی ۔ وہ ان کی درد بھری کہانی سن کر بہت متاثر ہوئے ۔ انھوں نے درگاہ ایزدی میں ان کے لیے دعا کی ۔ دیر تک سجدے میں پڑے رہے ۔ مراقبہ کے عالم میں ان کے

۱۔ کلیات غالب فارسی : جلد اول ، (لاہور ۱۹۶۷ء) ، ۲۴۱-۲۵۷ ۔

سامنے لوح محفوظ پیش ہوئی ۔ صوفی نے ان کی سرنوشت پڑھی ۔ ان کی تقدیر کے نوشتے میں حرماں نصیبی کے سوا کچھ نہیں لکھا تھا ۔ وہ بے حد مغموم ہوئے ۔ انھوں نے ترس کھا کر دوبارہ خدا تعالیٰ سے ان پر رحم کرنے ، ان کی خستہ حالی دور کرنے اور دولت و راحت سے مالا مال کرنے کی التجا کی :

بر دل اندوہ گزینم بہ بخش جرم سہ تن را بہ یقینم بہ بخش
خستہ دلانند تو مرہم فرست دولت و راحت ز پےٴ ہم فرست
اے تو خداوند جہاں رحم کن برمن و این غمزدگاں رحم کن

غیب سے ندا آئی کہ ان کی تقدیر کا بل نکلنا تو مشکل ہے ۔ ان کے نصیبے میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہو سکتا ۔ وہ جس حال میں ہیں اسی حال میں رہیں گے ۔ ہاں تمھاری خاطر ان کی ایک ایک دعا قبول کی جا سکتی ہے ۔ یہ چاہیں تو اس موقع سے فائدہ اٹھائیں ۔

صوفی نے انھیں یہ مژدہ سنایا ۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ، وہ اتنی سی بات پر باغ باغ ہو گئے ۔ پیرزال تو صبر کا دامن ہی ہاتھ سے کھو بیٹھی ۔ وہ سب سے پہلے اس دعا کی آزمائش پر آمادہ ہوئی ۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے جوانی طلب کی اور کہا ۔ ''میں بہت ستم رسیدہ ہوں ۔ ساری عمر غم سہتی رہی ہوں ۔ ہمیشہ فقر و فاقہ ہی میں کٹی ہے ۔ تیرگئی بخت کا اثر میرے سیہ خانے کی رونق رہا ہے ۔ کیسہ و کاسہ دونوں خالی ہیں ۔ گور کنارے آ چکی ہوں ، کچھ حاصل نہیں ہوا ۔ میرا خاوند بھی :

با دگراں ساغر عشرت زند بامن ژولیدہ بہ نفرت زند

میں چاہتی ہوں کہ ایک دفعہ پھر جوان اور رونق خوبان جہاں ہو کر زندگی کا لطف اٹھاؤں''۔ وہاں کس بات کی کمی تھی ۔ اس کی دعا قبول ہوئی اور وہ فوراً ایک نئی نویلی اور طرح دار دوشیزہ بن گئی ، جس کا حسن آفتیں ڈھاتا تھا ۔

اتنے میں ایک نوجوان شہزادہ اپنے لشکر سے بچھڑ کر وہاں آنکلا ۔ عورت نے اسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا ۔ جب شہزادہ اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا تو عورت نے اپنے بوڑھے خاوند اور لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ڈاکو ہیں اور مجھے زبردستی ایک قافلے سے بھگا لائے ہیں ۔ شہزادہ عورت کو لے کر وہاں سے چل دیا ۔

بوڑھا نہایت حسرت و اندوہ سے یہ منظر دیکھتا رہا ۔ دنیا اس کی نظروں میں اندھیر ہو گئی ۔ وہ جذبات انتقام سے بے قابو ہو گیا ۔ اس نے خدا سے التجائی کہ یہ بے وفا عورت مادہ خوک بن جائے ۔ اِدھر الفاظ بوڑھے کے منہ سے نکلے ، اُدھر عورت مادہ خوک بن گئی ۔ شاہزادہ یہ فوری انقلاب دیکھ کر ڈر گیا اور

اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا ۔

عورت (مادہ خوک) اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر اپنے لڑکے اور خاوند کے پاس واپس آئی اور نہایت رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی ۔ بوڑھے نے منہ پھیر لیا اور اس کی طرف التفات ہی نہ کیا ۔ مگر بیٹے کا دل بھر آیا ۔ ماں کی محبت اس کے خون میں جوش مارنے لگی ۔ اس نے نہایت عجز و زاری سے دعا کی ۔

خداوندا ! تو میری والدہ کو دوبارہ انسانی صورت عطا فرما دے ۔ یہ دعا بھی قبول ہوئی اور عورت پھر اپنی اصلی حالت میں آ گئی ۔

تقدیر کے آگے تدبیر کی کوئی پیش نہ چلی اور تینوں اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کا داغ لیے وہاں سے یہ کہتے ہوئے چل دیے :

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے

غالب کی یہ مثنوی تسلسل خیال ، حسن ترتیب ، فنی خوبیوں ، وقائع نگاری اور افسانے کی دلچسپی کے لحاظ سے ایک عجیب چیز ہے ۔ یہی خصائص ایک اچھی مثنوی کا طغرائے امتیاز ہو سکتے ہیں ۔ دیکھیے افلاس کی تصویر کتنی مکمل ہے :

دست تہی آئینۂ قسمتش — زخم دل و داغ جگر دولتش
خانہ اش از دشت خطرناک تر — پیرہنش از جگرش چاک تر
مایۂ او داغ و بہان بر سرش — حاصل او خاک و بہان در برش
ہر سحرش تیرہ تر از تیرہ شام — فاقہ پۓ فاقہ کشیدی مدام

یعنی اس کے خالی ہاتھ قسمت کا آئینہ تھے ۔ دل کے زخم اور جگر کے داغ ہی اس کی دولت تھے ۔ اس کا مکان ویرانے سے زیادہ دہشت ناک اور ہراس آفریں تھا ۔ اس کا پیراہن جگر سے زیادہ پھٹا ہوا تھا ۔ داغ اس کی پونجی اور خاک اس کی کمائی تھی جو ہر وقت اس کے سر پر پڑی رہتی تھی ۔ ہر صبح شام سے زیادہ تاریک تھی اور وہ فاقے پر فاقہ سہتا تھا ۔

عزیمت سفر کا منظر کس قدر ہولناک دکھایا ہے :

ہر سہ تن آئینۂ وحشت شدند — بادیہ پیمائی سیاحت شدند
ریخت جنون برتپش آہنگہا — ماند وطن دور بفرسنگہا
مرحلۂ چند نوشتند راہ — تا برسیدند بدشتے تباہ

''آئینۂ وحشت'' کی ترکیب بالکل اچھوتی اور قابل داد ہے ۔

لق و دق صحرا اور تشنگی وحدتِ آفتاب کا نقشہ کھینچنے میں بھی شاعرانہ کمال دکھایا ہے :

وادی دروے کہ ہزارش بلا — خاک بلا خیز و غبارش بلا

لالۂ خود روش ز خون شہید | ذرہ اش از جوہر تیغ یزید
گشت در آن وادی آشوبناک | جامۂ عریانی شان چاک چاک
ہر قدم آنجا بسر دار بود | عربدۂ آبلہ و خار بود
بود بہم ہر غم و رنجے کہ بود | تشنہ لبی آفت دیگر فزود
شد ہوس آب بدل شعلہ زن | سوختن آمد بہ جگر سوختن
ہوش دران معرکہ بے ہوش گشت | پا بوداعِ قدم آغوش گشت
تیزی رفتار ستم کردہ بود | پائے تگ و تاز قلم کردہ بود
آبلہ ساغر شد و ساغر نشد | زہرہ شد آب و لب شان تر نشد
از تپش دل بتمنائے آب | ظرف نہ بستند بجز اضطراب

پیر زال جب جوانی حاصل کرتی ہے تو مرزا غالب اس کے حسن و شباب کی تصویر میں یوں رنگ بھرتے ہیں :

دید کہ مہ چہرہ و زیبا ستم | حیرت خویشم چہ تماشا ستم
چہرہ بر افروخت ز تاب عذار | یافت خزاں را سر و برگ بہار
ارث خم پشت بکا کل رسید | سلسلۂ ناز بسنبل رسید
قمری طاؤس پدید آمدہ | چوں رمضان رفتہ و عید آمدہ
تازہ فسونے بہ تمنا دمید | شاد و نوان بر سر شوہر رسید
تاب عذارش بسیاہیِ موی | زد شبخونی بدل و جان شوی

یعنی بڑھیا نے دیکھا کہ اس کا چہرہ روکش مہتاب اور آئینہ دار آفتاب ہو گیا ۔ وہ حسن دلاویز کی مجسم مورت بن گئی ۔ رخسار کی آب و تاب سے اس کا چہرہ دمک اُٹھا ۔ خزاں دیدہ سرو کو باد بہاری نے نیا لباس پہنا دیا ۔ قد کی خمیدگی کاکل سیاہ نے چھین لی ۔ ناز و انداز عود کر آئے ۔ طاؤس طناز کی طرح اس کا جسم حسن کی رعنائیوں کا گہوارہ بن گیا ۔ گویا رمضان رخصت ہوا اور عید آ گئی ۔ آرزوؤں اور تمناؤں نے اس کے دل میں ایک نیا افسوں پھونکا اور وہ خراماں خراماں اپنے خاوند کے سامنے آئی تا کہ اپنے رخساروں کی آب و تاب اور بالوں کی سیاہی سے اس کے دل و جان پر شبخون مارے ۔

حسن کی رعنائی اور دلفریبی کی تصویر اس سے زیادہ مختصر الفاظ اور دلکش پیرایہ میں کیا کھینچی جا سکتی ہے ۔ یہ مثنوی غالب کے علو تخیل اور جذبات انسانی کی ترجمانی کا بہترین نمونہ ہے ۔ افسانے کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور مثنوی ختم کیے بغیر دل نہیں مانتا ۔

تقدیر کا فلسفہ کیا ہے ؟ اس سے بحث نہیں ۔ غالب نے اس قصے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے :

عالم تقدیر چنین است و بس | حاصل تحریر من این است و بس

بیادِ اقبال

گر دہد دست بکوی تو گذر خواہم کرد
تربت پاک ترا کحل بصر خواہم کرد

دلِ من شیفتۂ خوی تو و کوی تواست
دلِ خود را کی ازیں شیفتہ تر خواہم کرد

گرم اقبال شود یار باقبال تمام
بسوئ موطنِ اقبال سفر خواہم کرد

سفری با دل مشتاق و نیال و پر شوق
برِ اہل دل و ارباب نظر خواہم کرد

ہست چون جا یگہِ پاک دلان پاکستان
چون نسیم از دل آن خاک گذر خواہم کرد

تا بیک جا دل بے تاب قراری گیرد
برسر تربت اقبال مقر خواہم کرد

بادب پای نہادم چو در آن خلوت راز
ای بسا راز کہ از پردہ بدر خواہم کرد

بار اگر بر در اقبال دہندم ''گلچین''
طی این مرحلہ از شوق بسر خواہم کرد

گلچین معانی

ارمغان حجاز کی ایک رباعی

''سرور'' یا ''سرود''

غلام رسول مہر

حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی آخری تصنیف ''ارمغان حجاز'' کے صفحہ ۴۱ پر ایک رباعی (یا شعر گوئی کی مسلمہ اصطلاح کے مطابق ایک قطعہ) یوں درج ہے :

سرور رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگار این فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

یہ رباعی میں نے پہلی مرتبہ راجا حسن اختر مرحوم کی زبان سے اس روز سنی تھی ، جس روز حضرت علامہ مرحوم رہگرائے عالم بقا ہوئے تھے اور اس وقت ان کی میت کو غسل بھی نہیں دیا گیا تھا ۔ میں ، راجا صاحب اور بعض اور اصحاب ''جاوید منزل'' کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے ۔ حضرت کا انتقال چھ بجے صبح کے قریب ہوا تھا اور راجا حسن اختر اس سے ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر کی کیفیت سنا رہے تھے ۔ انھوں نے کہا کہ میں پھرتے پھراتے آیا اور باہر کے کمرے میں پڑی ہوئی چارپائی پر سو گیا ۔ علی بخش نے مجھے جگایا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب (علی بخش ہمیشہ مرحوم کو ''ڈاکٹر صاحب'' یا ''شیخ صاحب'' ہی کہا کرتا تھا) یاد کر رہے ہیں ۔ میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ حکیم قرشی صاحب کو بلا لائیے ۔ راجا صاحب کہتے تھے ، میں نے عرض کیا کہ قرشی صاحب رات کے بارہ بجے گھر گئے ہیں ، ذرا صبح ہو جائے تو میں بلا لاؤں گا ۔ فرمایا : ''رات جس تکلیف میں گزری ہے ، اس کی کیفیت بیان کرنا مشکل ہے'' ۔

یہ سنتے ہی راجا صاحب جانے کے لیے تیار ہو گئے ۔ اس وقت حضرت نے یہ رباعی سنائی ۔ اس میں ''سرود رفتہ'' ہی پڑھا تھا کیوں کہ حضرت کی زبان مبارک سے یہی سنا تھا ۔ پھر یہ رباعی اس زمانے (اپریل ۱۹۳۸ یا بعد) کے جرائد و رسائل میں شائع ہوئی ۔ سب نے ''سرود'' ہی چھاپا بلکہ اس کی تضمین

بھی کی گئی ۔ ''سرور'' کہیں نہ دیکھا ۔

''ارمغان حجاز'' زیر طبع تھی تو ایک روز چودھری محمد حسین مرحوم و مغفور نے مجھ سے ذکر کیا کہ ''سرور'' ہونا چاہیے یا ''سرود'' ۔ میں نے کہا کہ زیادہ موزوں ''سرود'' ہی معلوم ہوتا ہے نہ کہ ''سرور'' ۔ غالباً میں نے کچھ حوالے بھی دیے تھے ، جن کی صحیح کیفیت اس وقت یاد نہیں آتی ۔ چودھری صاحب کی گفتگو سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ انھیں تحریر شدہ رباعی دیکھ کر اشتباہ ہوا ، تاہم مجھے یقین تھا کہ ''ارمغان'' میں ''سرود'' ہی چھپا ہے ۔

گزشتہ تیس سال میں ''ارمغان حجاز'' خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھی ۔ یہ رباعی یا دوسری رباعیاں ، جو یاد تھیں ، آئیں تو کتاب دیکھے بغیر ہی پڑھ کر آگے نکل جاتا ۔ کبھی غور سے نہ دیکھا کہ کیا چھپا ہے ۔

کئی احباب نے ذکر کیا کہ ''ارمغان'' میں ''سرور'' چھپا ہے ۔ میں بتاتا رہا کہ یہ غلط ہے لیکن خود غلطی پر متنبہ نہ ہوا ۔

پچھلے دنوں ''ارمغان'' کی کاپیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ تو اس میں ''سرور'' دیکھ کر میں نے کتاب کا پہلا ایڈیشن نکالا اور دیکھا تو اس میں ''سرود'' ہی تھا ۔ میں نے عزیز مکرم ڈاکٹر جاوید اقبال سے بھی ذکر کیا ، لیکن ان کا تاثر بھی بظاہر یہی تھا کہ پہلے ایڈیشن میں ''سرور'' ''سرود'' ہی ہے ۔

سب سے پہلے یہ رباعی راجا حسن اختر مرحوم نے حضرت کی زبان مبارک سے سن کر سنائی تھی تو ''سرود'' ہی سنایا نہ کہ ''سرور'' اورر اجا صاحب ''سرود'' و ''سرور'' میں امتیاز کی صلاحیت سے بوجہ اتم بہرہ مند تھے ۔ پھر ''سرور'' اصل رباعی میں معنویت کے ان تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا ، جو بظاہر حضرت علامہ کے پیش نظر ہو سکتے تھے ۔ اس میں صحیح ''سرود'' ہی تھا نیز لکھتے وقت ''ر'' اور ''د'' میں اشتباہ غیر اغلب نہ تھا اور غالباً دوسری رباعیوں کی طرح یہ رباعی بھی حضرت مرحوم نے اپنے دست مبارک سے نہیں لکھی تھی ، کسی سے لکھوائی تھی ۔ یہ معلوم نہیں کس سے ؟ نہیں کہا جا سکتا کہ ان صاحب نے ایک ایک لفظ ٹھیک ٹھیک سنا اور ٹھیک ٹھیک لکھا یا تحریر میں ''د'' اور ''ر'' کا فرق واضح طور پر ملحوظ رکھا ۔

ایک قدم اور آگے بڑھائیے ۔ یہ موقعہ اور محل ''سرود'' کا تھا ، جس سے مقصود احیاء ملت و احیاء اسلامیت کی دعوت تھی ، ''سرور'' کا نہ تھا ، جس کا تعلق انسان کی داخلی اور اندرونی کیفیت سے ہے اور اسے بعید سی توجیہات کے بعد بھی ''دعوت'' کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا ۔

حضرت علامہ نے ''سرود''، ''نوا''، ''بانگ''، ''بانگ درا'' دعوت کے لیے جابجا استعمال کیے ہیں بلکہ ''سرود رفتہ'' اور ''نواہائے رفتہ'' کی مثالیں بھی ملتی ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے :

چھیڑو ''سرود'' ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کو تاب جبیں تمھاری

چاک اس بلبل تنہا کی ''نوا'' سے دل ہوں
جاگنے والے اسی ''بانگ درا'' سے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا ''لے'' تو حجازی ہے مری

کیوں چمن میں بے صدا مثل رم شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا ''سرود'' بربط عالم ہے تو

قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
گوش آواز ''سرود رفتہ'' کا جویا تیرا
درد دل ہنگامہ حاضر سے بے پروا تیرا

بانگ‌درا ص ۲۰۶

تیرے ''سرود رفتہ'' کے نغمے علوم نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد

(بانگ‌درا ص ۲۴۸)

غزل سرای و ''نواہائے رفتہ'' باز آور
بہ این فسردہ دلاں حرف دل‌نواز آور

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بدیہی حقائق کے ہوتے ہوئے ''سرور رفتہ'' کو کیوں ترجیح دی گئی ، حالانکہ خاص اس مقام پر سرور رفتہ کی موزونیت ہی نہیں جواز کا معاملہ بھی محل نظر ہے ۔

سب سے آخر میں یہ کہ یہ باب حضور حق کی بائیسویں رباعی ہے اور تئیسویں رباعی جو اس کے بعد آتی ہے اس کے مضمون کا تکملہ ہے یعنی جو کچھ حضرت

مرحوم کہنا چاہتے تھے ، اس کی ابتدا بائیسویں رباعی سے ہوئی اور تئیسویں رباعی میں اسے پورا کیا ۔ وہ رباعی ملاحظہ فرمائیے :

اگر می آید آں دانائے رازے بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیر امتاں را می کند پاک کلیمے یا حکیمے نے نوازے

آپ سوچیں کہ جب تک پہلی رباعی میں ''سرود'' نہ پڑھیں گے ''نوائے دل گدازے'' اور کلیمے نے نوازے کے لیے کس طرح اور کیوں کر گنجائش پیدا کریں گے ؟ یہ دونوں ٹکڑے ''سرور'' پڑھنے سے تو سراسر غیر موزوں اور بے محل ٹھہراں گے ۔

گویا حضرت مرحوم کہنا یہ چاہتے تھے کہ میرا دور تو اختتام کو پہنچ گیا ۔ اب معلوم نہیں کوئی دانائے راز آتا ہے یا نہیں ۔ ''سرود رفتہ'' دوبارہ سنائی دیتا ہے یا نہیں دیتا ۔ پھر فرماتے ہیں اگر کوئی اور دانائے راز آئے تو اے باری تعالیٰ تو اپنی رحمت سے اسے دل گداز نوا عطا کر ۔ کیوں کہ امتوں کے ضمیر کو آلائشوں سے پاک کرنے کا کام یا تو کسی کلیم اللہ کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے یا کسی ایسے حکیم کے ہاتھوں جو نے نواز ہو ۔

آخر دوسری رباعی کو پہلی سے متعلق رکھنے کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ ''سرور'' کی جگہ ''سرود'' رکھا جائے اور یقیناً حضرت علامہ نے ''سرود'' ہی لکھا تھا ۔ مگر وہ غلط فہمی کی بنا پر ''سرور'' بن گیا ۔

غرض گزارش یہ ہے کہ ''سرور رفتہ'' وہاں کسی بھی اعتبار سے موزوں نہیں ، خدا جانے یہ کس طرح راستہ پا کر وہاں پہنچ گیا ۔ جن جن اصحاب نے مختلف اوقات میں مجھ سے سرور کا ذکر کیا ، میں یہی کہتا رہا کہ ہاں بالکل نامناسب و غیرموزوں ہے بلکہ خاص اس مقام پر ''سرور'' کو بےمعنی قرار دینے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کیوں کہ اس کی وجہ سے نہ اس رباعی کی معنویت حقیقتہً جلوہ گر ہو سکتی ہے اور نہ اگلی رباعی سے اس کا رشتہ و واسطہ قائم ہو سکتا ہے ۔ یہاں ''سرود رفتہ'' تھا اور وہی رہنا چاہیے ۔

امید ہے کہ ارباب فکر و نظر اس عاجزانہ گزارش پر خاص توجہ مبذول فرمائیں گے تاکہ غلطی کی اصلاح ہو جائے اور ''سرور'' کی جگہ ''سرود'' کو دے دی جائے جو اس جگہ کا حقدار ہے ۔

یاد ایام

میری ذاتی ڈائری میں ذکر اقبال

خواجہ عبدالوحید

بیسویں صدی عیسوی کے عشرۂ اول کے نصف آخر میں لاہور میں ایک مکان ''للی لاج'' (Lily Lodge) کے نام سے تھا ۔ بازار حکیماں سے بازار سید میٹھا کو جو راستہ جاتا ہے اور جو اب تحصیل بازار کہلاتا ہے اس کے مشرقی سرے سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ کو ایک محلہ تھا جسے ''تھڑیاں بھابھڑیاں'' کہتے تھے ۔ اس محلہ کی بیشتر آبادی جینیوں کی تھی ۔ ''للی لاج'' اسی محلہ میں واقع تھا ۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں اس مکان میں لاہور کے روشن خیال مسلمان بزرگوں کا ہر شام اجتماع ہوتا تھا ۔ خاصی رات گئے تک اہم علمی ، ادبی اور قومی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ۔ اس اجتماع میں شرکت فرمانے والے بزرگوں میں سر محمد اقبال ، سر عبدالقادر ، سر شہاب الدین ایسے حضرات شامل تھے[1] ۔ اسی محفل میں مولانا ظفر علی خان نے حیدر آباد سے آنے کے بعد لاہور سے ''زمیندار'' شائع کرنے کا پہلی بار اعلان کیا تھا ۔

مذکورہ بالا بیشتر بزرگ شہر کے اسی حصے میں رہتے تھے ۔ سر عبدالقادر تو تھڑیاں بھابھڑیاں سے ملحق ایک گلی میں رہتے تھے ، سر شہاب الدین بازار جج عبداللطیف میں رہتے تھے جو بازار حکیماں سے جانب مغرب واقع ہے ۔ اس محفل کے ایک اور اہم رکن مولوی احمد دین صاحب مصنف ''سر گزشت الفاظ'' لوہاری منڈی کی ایک گلی میں قیام رکھتے تھے ۔ سر محمد اقبال جو اس زمانے میں یورپ سے ڈاکٹریٹ اور قانون کی سند لے کر آ چکے تھے ، ۱۹۰۸ع میں اس محفل میں شرکت فرمانے لگے تھے[2] ۔ وہ اس زمانے میں انار کلی بازار میں رہتے تھے ۔

۱۔ اس زمانہ میں یہ حضرات صرف ''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال''، ''شیخ عبدالقادر'' اور ''چودھری شہاب الدین'' کے ناموں سے موسوم تھے ۔ نائٹ ہڈ کا خطاب ان حضرات کو مدتوں بعد ملا ۔

۲۔ یہ محفل ۱۹۱۸ع میں منتشر ہوگئی اس لیے کہ والد مرحوم خواجہ کریم بخش سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر وسط ہند کی ایک ریاست میں چلے گئے تھے اور عم محترم

''للی لاج'' تین بھائیوں ، خواجہ کریم بخش صاحب ، خواجہ رحیم بخش صاحب اور خواجہ امیر بخش صاحب کی مشترکہ جائداد تھی ۔ خواجہ کریم بخش صاحب ان تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ۔ راقم الحروف انھی کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے[۳] ۔

میں نے علامہ مرحوم کو اس زمانے میں کم و بیش دس برس قریب سے دیکھا اور یہ موقع مجھے اپنے مکان ''للی لاج'' ہی میں ملتا رہا ۔ خود ان کے مکان واقع انارکلی میں جانے کا موقع نہ ملا ۔ جب میرے چچا زاد بھائی خواجہ فیروز الدین احمد[۴] کی شادی حضرت علامہ کی خواہر نسبتی سے ہوئی تو اس کے بعد میرا آنا جانا ان کے ہاں شروع ہو گیا ، لیکن وہاں مجھے ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع بہت کم ملتا تھا ۔ میں ان کے ہاں بالعموم ان دنوں جایا کرتا تھا جب کہ ان کے صاحب زادے آفتاب اقبال گجرات سے آ کر وہاں قیام کیا کرتے تھے ۔ آفتاب صاحب میرے ہم عمر تھے اور خواجہ فیروزالدین احمد صاحب کی شادی کے دوران ان سے میرے دوستانہ مراسم قائم

خواجہ رحیم بخش صاحب بھی بسلسلۂ ملازمت مشرق پنجاب میں رہنے لگے تھے ۔ میرے دوسرے چچا خواجہ امیر بخش صاحب کا انتقال ۱۹۱۴ع میں ہو چکا تھا ۔ ۱۹۴۷ع کے فسادات میں تھڑیاں بھابھڑیاں کے تمام مکانات نذر آتش ہو گئے ۔ ۱۹۶۰ع میں میں نے اس آتش زدہ علاقے کو دیکھا تو تمام علاقہ جھونپڑیوں سے بھرا ہوا تھا ۔

۱۹۱۸ع سے اقبال مرحوم نے بازار حکیماں میں مولوی احمد دین صاحب ''سرگزشت الفاظ'' کے مکان کی محفلوں میں بیٹھنا شروع کر دیا ۔

۳- میں نے ۸ ، ۱۰ برس کی عمر میں ''للی لاج'' کی محفلوں میں بیٹھنا شروع کیا تھا ۔ اگرچہ میں اس عمر میں ان بزرگوں کی بہت سی باتیں نہ سمجھ سکتا تھا لیکن ان سب کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے مدت تک حاصل رہا ۔

۴- خواجہ فیروز الدین مرحوم میرے چچا زاد بھائی تھے (خان بہادر خواجہ رحیم بخش کے صاحب زادے) ۔ وہ اس زمانے میں علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ۔ ۱۹۱۴ع میں وہ انگلستان چلے گئے اور ۱۹۱۷ع میں وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے اور لاہور میں انھوں نے وکالت شروع کر دی ۔ قیام پاکستان سے قبل وہ لاہور کے چوٹی کے وکلا میں شمار ہوتے تھے ۔ ۱۹۱۹ع میں جب رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر پنجاب میں مارشل لا لگا تو لاہور میں سب سے پہلے جو سرکردہ لوگ سیاسی کار گزاریوں کی بنا پر گرفتار ہوئے ان میں خواجہ صاحب موصوف بھی شامل تھے ۔ اُن کے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں سید محسن شاہ صاحب ایڈووکیٹ لاہور بھی تھے ۔

ہو گئے تھے جو آج تک بدستور قائم ہیں[۵] ۔

اس زمانے میں حضرت علامہ مرحوم ہمارے ہاں آتے ہی حقہ طلب فرمایا کرتے تھے اور بارہا میں خود ان کے سامنے حقہ لا کر رکھا کرتا تھا[۶] ۔

۱۹۱۶ء میں میں نے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو خواہش ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا جائے ۔ لیکن اس میں دقت یہ آ پڑی کہ گورنمنٹ کالج میں صرف فرسٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کرنے والوں کو داخلہ ملتا تھا اور میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا ۔ چوں کہ حضرت علامہ اس کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے اس لیے لیفٹیننٹ کرنل جے سٹیفنسن (Lt. Col. J. Stephenson) پرنسپل گورنمنٹ کالج کے ان سے گہرے مراسم تھے ۔ چنانچہ میں نے حضرت علامہ سے ایک سفارشی رقعہ ان کے نام لیا اور مجھے بغیر کسی دقت کے کالج میں داخلہ مل گیا[۷] ۔

۱۹۱۸ میں ''للی لاج'' کا مجلسی مرکز ختم ہو گیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ۔ پرانی محفلیں ختم ہو گئیں اور ان میں شامل ہونے والے سب بزرگ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے ۔ حضرت علامہ اب میرے رشتہ کے عم محترم مولوی احمد دین صاحب کے مکان پر جو بازار حکیماں میں واقع تھا ، بیٹھنے لگے ۔ مولوی صاحب مرحوم اس زمانے میں لوہاری منڈی سے نقل مکانی فرما کر اس مکان میں آ چکے تھے ۔ مولوی صاحب لاہور کے نامور وکلا میں سے تھے اور برسوں اسلامیہ کالج کمیٹی کے سکریٹری رہے ۔ خاموشی سے ٹھوس علمی کام کرنے والے بزرگ تھے ۔ عزیزی مشفق خواجہ نے حال ہی میں ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے[۸] ۔

جیسا کہ میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع صاحب مرحوم نے ، اپنی تحریروں[۹]

۵۔ آفتاب اقبال صاحب بعد میں انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں ۔ اس وقت ان کا شمار ممتاز وکلا میں ہوتا ہے ۔

۶۔ میں نے حضرت علامہ کو شروع سے لے کر آن کی وفات تک (تقریباً تیس برس) حقہ پیتے دیکھا اور کبھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے اس تمام زمانے میں شراب کو ہاتھ لگایا ہو ۔

۷۔ داخلے کے لیے انٹرویو کے وقت پرنسپل نے حضرت علامہ کی سفارش کی وجہ سے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا ۔

۸۔ دیکھیے ''اقبال ریویو'' بابت جولائی ۱۹۶۷ ، مضمون زیر عنوان ''اقبال اور مولوی احمد دین'' ۔

۹۔ ''خون بہا'' شائع کردہ تاج کمپنی ، لاہور اور ''لاہور کا چیلسی'' مجلہ ''نقوش'' لاہور ، شمارہ نمبر ۱۰۴ ، جنوری ۱۹۶۶ ۔

میں ذکر فرمایا ہے ''للی لاج'' کی محفلوں میں حضرت علامہ سر محمد اقبال کی صلاحیتوں کو پنپنے کا بہترین موقع ملا اس لیے کہ ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ بہترین ادبی ذوق رکھتے تھے ۔ یہ محفلیں شعر و ادب کا بہترین گہوارہ تھیں ۔ علامہ محترم ''للی لاج'' کی ان محفلوں میں اپنی شعری تخلیقات پیش فرماتے اور داد پاتے ۔ آپ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں جو طویل نظمیں اس زمانے میں پڑھیں وہ اکثر آپ نے انجمن کے جلسے سے پہلے اس محفل میں سنائیں ۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ یہ تمام نظمیں میں نے ''للی لاج'' میں حضرت علامہ کے قریب بیٹھ کر سنیں ۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ میں ان کی بہت کم باتیں سمجھ سکتا تھا ۔

''للی لاج'' کی محفلیں ختم ہونے کے دس برس بعد یعنی ۱۹۲۸ میں میں نے لاہور میں ایک علمی ادارے ''اسلامک ری سرچ انسٹی ٹیوٹ'' کی بنیاد رکھی ۔ اسی سال لاہور میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا پانچواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا ۔ اس کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت حضرت علامہ اقبال نے فرمائی ۔ میں نے ان کے زیر صدارت ایک مقالہ ''قرآن حکیم اور سائنٹیفک سپرٹ'' بزبان انگریزی پڑھا[۱۰]۔ اب میرا ملنا جلنا حضرت علامہ سے از سر نو جاری ہو گیا ، تا آنکہ ۱۹۳۴ء میں انجمن خدام الدین (شیرانوالہ دروازہ لاہور) نے اپنا پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''اسلام'' جاری کیا جس کی ادارت کا فریضہ میرے سپرد ہوا ۔ حضرت علامہ مرحوم اس اخبار میں دل چسپی لینے لگے اور اس میں شذرات لکھنے میں بارہا میری راہنمائی فرماتے ۔ ان کے متعدد مضامین اور بیانات بھی اس اخبار میں شائع ہوئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت علامہ تحریک قادیانیت پر بڑی کڑی تنقید کرنے لگے تھے ۔ آپ کا معرکہ آرا مضمون ''اسلام اور احمد ازم'' سب سے پہلے اسی اخبار ''اسلام'' بابت ۲۲ مئی ، ۱۹۳۶ میں شائع ہوا تھا ۔ حضرت علامہ اس اخبار کو بالالتزام ملاحظہ فرمایا کرتے تھے اور اس کے مضامین شائع ہونے سے پہلے پڑھ کر یا مجھ سے سن کر ان میں رد و بدل بھی تجویز فرماتے تھے[۱۱] ۔

۱۰۔ اس مقالے کا اُردو ترجمہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے مشہور ماہ نامہ ''معارف'' بابت جنوری و فروری ، ۱۹۳۰ میں دو اقساط میں شائع فرمایا ۔

۱۱۔ انجمن خدام الدین کا یہ ترجمان ''اسلام'' ۲۲ جون ۱۹۳۴ کو جاری ہوا اور مارچ ۱۹۴۰ میں بند ہو گیا ۔ اس تمام عرصے میں اس کی اشاعت میں کبھی ناغہ نہیں ہوا ۔

۱۹۳۴ء میں جب حضرت علامہ نے اپنا مکان ''جاوید منزل'' میو روڈ پر تعمیر کرایا تو اسی زمانے میں میں نے بھی اس سڑک کی دوسری طرف محلہ مہد نگر میں مکان بنا لیا تھا ، اس لیے میرا آنا جانا آپ کے ہاں روزمرہ کا معمول ہو گیا ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں گھر سے دفتر جانے کے لیے نکلتا اور یہ معلوم ہونے پر کہ حضرت علامہ گھر پر اکیلے بیٹھے ہیں ، میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور اطمینان سے ان کی باتیں سنتا رہتا ۔ اسی طرح رات کو جب میں دوست احباب سے مل کر گھر واپس لوٹتا تو پھر حضرت علامہ کے ہاں رکتا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب ان کے پاس کوئی صاحب نہیں بیٹھے ہیں میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور پھر خاصی رات گئے تک ان کی باتیں سنتا رہتا ۔

میں نے کبھی حضرت علامہ سے کسی مسئلے پر بحث نہیں کی بلکہ ہمیشہ ایک آدھ سوال کر دیا کرتا جس کے جواب میں حضرت علامہ علم کے سوتی بکھیرتے رہتے ۔ میں بغور ان کی باتیں سنتا اور گھر آ کر اپنی ڈائری میں ان کو انھیں کے الفاظ میں محفوظ کر لیتا ۔ خوش قسمتی سے میری اس زمانہ کی ڈائری کے بعض اجزا آج تک محفوظ رہ گئے ہیں ، یہ یادداشت انھیں سے مرتب کی گئی ہے ۔

اسی سال ۱۹۳۴ء میں جب علامہ مرحوم ابھی اپنی میکلوڈ روڈ والی قیام گاہ میں مقیم تھے ، جامعہ ملیہ نے مشہور عالم مجاہد حسین رؤف بے کو توسیعی لکچروں کے لیے دہلی آنے کی دعوت دی ۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے خط و کتابت کی اور غازی رؤف بے کو لاہور آنے کی دعوت بھیجی ۔ چنانچہ وہ فروری ۱۹۳۵ء میں لاہور تشریف لائے اور اسلامک ری سرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ' عام میں انھوں نے تقریر کی ، اس جلسے کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی ۔ اس موقع پر خاصی رقم صرف ہوئی ، اس لیے کہ خود مہمان عزیز کے دہلی سے لاہور آنے اور واپسی کے اخراجات کے علاوہ ایک بڑے پیمانے پر عصرانے کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑے تھے ۔ اس رقم کی فراہمی میں حضرت علامہ نے میری بہت امداد فرمائی ۔ انھوں نے خود بھی ان کاموں کے لیے چندہ دیا اور لاہور کے کئی ایک روسا سے بھی چندہ دلوایا ۔

غازی حسین رؤف بے دور حاضر کے عظیم ترین ترک مجاہدین میں سے تھے ۔ جنگ عظیم اول میں ان کے زیر کمان بحیرۂ روم (Mediterranean Sea) میں ترکی جنگی جہاز ''حمیدیہ'' نے تہلکہ مچا رکھا تھا ۔ انقلاب ترکیہ کے بعد وہ جمہوریہ ترکیہ کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے ۔ بعد میں مصطفیٰ کمال پاشا سے اختلاف کی بنا پر انھیں اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا تھا لیکن

اس کے باوجود انھوں نے ہندوستان میں اپنے لکچروں میں ایک لفظ بھی مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف نہیں کہا ۔

اس زمانے کا ایک دل چسپ قصہ یہ ہے کہ ، جیسا اوپر بیان کر آیا ہوں ، میں اکثر اخبار ''اسلام'' کے شذرات اور اداریوں کے لکھنے میں حضرت علامہ سے مشورہ لیا کرتا تھا ۔ ان مشوروں کے وقت خان بہادر چودھری محمد حسین صاحب (جو حضرت علامہ کے بہت ہی مخلص دوست تھے) اکثر موجود ہوتے تھے ۔ وہ اس زمانے میں پنجاب گورنمنٹ کے پریس ایڈوائزر تھے ۔ ادھر میں حضرت علامہ کے مشورے سے اخبار میں مضمون لکھتا ، اُدھر چودھری صاحب کی طرف سے سرکاری چٹھی آ جاتی کہ ایڈیٹر ''اسلام'' آ کر پریس ایڈوائزر سے ملے ۔ اگرچہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اخبار پر میرا نام بحیثیت ایڈیٹر نہیں ہوتا تھا لیکن چودھری صاحب سے ملنے کے لیے ہمیشہ میں ہی جاتا اور وہ فرماتے ''آپ کے اخبار کا فلاں مضمون حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے ، آیندہ ایسا مضمون نہ لکھیے گا'' ۔ میں ''بہت اچھا'' کہہ کر واپس آ جاتا ۔ اب جنگ عظیم ثانی شروع ہو چکی تھی ۔ میں نے ایک مضمون ''اسلام'' کے صفحۂ اول پر بعنوان ''مشرقی ممالک میں اہل مغرب کے مظالم'' شائع کیا جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے ایسے اقتباسات جمع کر دیے گئے تھے جن میں مسلمانوں پر اہل مغرب کے مظالم کی بڑی درد انگیز تفصیل تھی ۔ اس پر پریس ایڈوائزر کی طرف سے اطلاع آ گئی کہ ''اسلام'' کے ناشر مبلغ پانچ سو روپے کی ضمانت داخل کریں ۔ ہم نے ہائی کورٹ میں اس حکم نامے کے خلاف اپیل کی جو نامنظور ہوئی ۔ اس پر بجائے زر ضمانت داخل کرنے کے اخبار بند کر دیا گیا تاکہ ضمانت ضبط ہونے کا امکان باقی نہ رہے ۔

حضرت علامہ سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے ایک روز پیشتر ہوئی ۔ میں جاوید منزل کے صحن میں کھڑا ہوا علی بخش مرحوم سے حضرت علامہ کی صحت کا حال دریافت کر رہا تھا ۔ حضرت علامہ نے کمرے کی بند کھڑکی کے شیشے میں میرا عکس دیکھا اور دوسرے ملازم رحمان سے جو ان کے پاؤں دبا رہا تھا پوچھا کہ باہر کون کھڑا ہے اور جب اس نے میرا نام لیا تو آپ نے اس سے کہا کہ ''انھیں اندر بلاؤ''۔ چنانچہ میں حسب الارشاد حاضر ہوا ۔ مزاج پرسی کے بعد آپ نے گفتگو شروع فرمائی جو بہت ہی پر اثر اور فکر انگیز تھی ۔ اس روز آپ کی باتوں میں بہت جوش تھا اور آپ بار بار بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتے اور پھر تھک کر لیٹ جاتے ۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آپ کو شدید تکلیف ہو رہی ہے ، لیکن

آپ کے جوش کا یہ عالم تھا کہ گفتگو ختم ہونے میں نہ آتی تھی ۔ بالآخر میں نے موقع پا کر اجازت لی اور اس احساس کے ساتھ باہر نکلا کہ آج میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہوئی ۔ اگلے روز علی الصبح معلوم ہوا کہ گزشتہ شب حضرت علامہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

ایک اور واقعہ یہاں قابل ذکر ہے ۔ ۱۹۳۲ میں جب حضرت علامہ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت فرما کر واپس وطن تشریف لائے تو میں نے پہلی مرتبہ اسلامک ری سرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ''یوم اقبال'' کی تقریب کا اہتمام کیا ۔ یہ تقریب بہت ہی کامیاب رہی ۔ اس سلسلے میں ایک عصرانہ بھی حضرت علامہ کے اعزاز میں دیا گیا ۔ اس کی مکمل کاروائی روزنامہ انقلاب مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۲ میں شائع ہوئی ۔ لیکن حضرت علامہ کی وفات کے بعد جو ''یوم اقبال'' لاہور کی انٹر کالیجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیر اہتمام منایا گیا تھا اسے عام طور پر ''پہلا یوم اقبال'' کہا جانے لگا ہے ۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم جو میرے بہت ہی مخلص دوست اور رفیق کار تھے اور جنھوں نے ۶ ستمبر ۱۹۳۲ کے اجلاس ''یوم اقبال'' میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا ، خود انھوں نے لاہور کے انگریزی روز نامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں قیام پاکستان کے بعد ایک مضمون بعنوان ''پہلا یوم اقبال'' لکھا ، جس میں ۱۹۳۸ میں ہونے والے ''یوم اقبال'' کو پہلا یوم اقبال قرار دیا ۔ میں نے مولانا عبدالمجید سالک کے فرزند ارجمند ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو متوجہ کیا تو انھوں نے روزنامہ انقلاب کی فائلوں میں سے ۷ ستمبر ۱۹۳۲ کا پرچہ برآمد کر لیا اور پھر انھوں نے روزنامہ ''کوہستان'' لاہور کی اشاعت ۲۱ اپریل ۱۹۶۲ میں ایک مضمون بعنوان ''پہلا یوم اقبال'' شائع کیا جس میں ۶ مارچ ۱۹۳۲ کی تقریب کی پوری کاروائی نقل کی گئی تھی ۔

اب میں اپنی ڈائری کے وہ حصے یہاں نقل کرتا ہوں جن میں علامہ اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل ہے ۔

۸ اکتوبر ، ۱۹۳۲ :

آج رات ۸ بجے کے قریب ریلوے اسٹیشن سے گھر[۱۲] آتے ہوئے جب میں علامہ اقبال کی کوٹھی[۱۳] کے سامنے سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ حضرت علامہ سے

۱۲- میں اس زمانے میں مزار داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ سے ذرا آگے بڑھ کر ایک نئی آبادی میں رہتا تھا جو بعد میں ''بلال گنج'' کے نام سے موسوم ہوئی ۔

۱۳- حضرت علامہ اس وقت تک میکلوڈ روڈ والے مکان میں رہتے تھے اور ''جاوید منزل'' کی تکمیل تک آپ اسی میں رہے ۔

ملاقات کر لوں ۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ آپ سامنے برآمدے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک چھوٹی سی کتاب دیکھ رہے ہیں ۔ سوائے ایک ملازم کے جو آپ کے پاؤں[۱۴] دبا رہا تھا اور کوئی آپ کے پاس نہ تھا ۔ میں پونے نو بجے شب سے پونے گیارہ بجے شب تک آپ کے پاس بیٹھا رہا ۔ بڑی ہی پر لطف صحبت رہی ۔ بے شمار باتیں آپ نے مختلف موضوعات پر فرمائیں اور اس تمام مدت میں ان کے اور میرے علاوہ اور کوئی شخص وہاں نہ آیا ۔

جو لطف اور خوشی میں نے ان دو گھنٹوں میں حاصل کی وہ میری زندگی کا ایک بے بہا سرمایہ ہے ۔ یقیناً یہ دو گھنٹے میری زندگی کے بہترین اوقات میں سے تھے[۱۵] ۔

جی چاہتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو حضرت علامہ نے میرے سامنے ارشاد فرمائیں لفظ بلفظ یہاں دہرا دوں ۔ لیکن آپ کے ملفوظات کی کثرت مانع ہو رہی ہے ۔ ایک بہت بڑی خوش خبری آپ نے یہ سنائی کہ ”میں اپنے دل میں اس بات کی بڑی زبردست خواہش رکھتا ہوں کہ قرآن حکیم پر اپنے خیالات تفصیل سے ایک کتاب میں ظاہر کروں“ ۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ”میں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے اپنے اشعار میں کر دیا ہے ، لیکن ابھی میرے دل میں اس سے بھی ایک بڑی چیز ہے جو قرآن حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے

۱۴ ۔ اس زمانہ میں حضرت علامہ کی صحت بگڑ چکی تھی اور اکثر ایک آدمی آپ کا جسم دبایا کرتا تھا ۔

۱۵ ۔ میں نے اس زمانے میں یہ دستور بنا لیا تھا کہ حضرت علامہ کے پاس اسی وقت بیٹھتا جب دوسرا کوئی اور شخص نہ ہوتا ۔ اس لیے کہ یہ زمانہ کانگریس اور لیگ کے جھگڑوں کا تھا ۔ اور اکثر لوگ اسی قسم کے جھگڑے چھیڑ دیا کرتے تھے ۔ میں حضرت علامہ کی خدمت میں ان کے ارشادات عالیہ علمی موضوعات پر سننے کے لیے جاتا تھا اور اس بات کی بھی خاص کوشش کرتا تھا کہ خود کچھ نہ کہوں صرف آپ کو سنتا رہوں ۔ چنانچہ میرا اکثر یہ دستور تھا کہ کوئی سوال اسلام کی تاریخ یا تمدن کے متعلق کر دیتا اور اس کے جواب میں جو کچھ وہ فرماتے بغور سنتا رہتا ۔ اور پھر اپنے گھر پہنچ کر وہ تمام باتیں من و عن اپنی ڈائری میں ضبط تحریر میں لے آتا ۔ میری کوشش تو یہی رہی کہ میں مرحوم کے الفاظ من و عن لکھوں ۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ کہیں کوئی لفظ یا جملہ ان کی زبان سے نہ نکلا ہو لیکن اس کے باوجود امید ہے کہ مفہوم آپ ہی کا ہوگا ۔

کی آرزو رکھتا ہوں'' ۔ اس کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس کام کو ایک ہی صورت میں یکسوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ کم از کم پانچ سال کے لیے ان کو افکار روزگار سے فرصت مل جائے[۱۶] ۔

افسوس ہے کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم النظیر فلسفی اور حکیم کے لیے مسلمان قوم فراغت کا سامان مہیا نہ کر سکی ۔ مسلمان قوم کی بے سرو سامانی کا اس سے بڑھ کر بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے ۔

دوران گفتگو میں حضرت علامہ نے مسلمانان ہند کے متعلق فرمایا کہ ''میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بے کار ہو گئے ہیں بالخصوص ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان'' ۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر کبھی کام آ سکتے ہیں تو غریب مزدوری پیشہ یا دکان دار لوگ جن کے لیے ان کے دل میں محبت اور احترام ہے اور جن سے مل کر انھیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے[۱۷] ۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ ان کے نزدیک مستحق التفات نہیں ، یہاں تک کہ اگر وہ ''ڈکٹیٹر'' بن جائیں تو وہ اس گروہ کو ختم کر دیں[۱۸] ۔ ایک موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اسلام کا مستقبل دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر منحصر ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں پر ۔

اس بات کا افسوس ہے کہ میری ڈائری صرف ۱۳ جولائی ۱۹۳۰ سے محفوظ ہے ۔ اس لیے ان اوراق میں اس تاریخ سے قبل کے اندراجات نہ ملیں گے ۔

۱۶- حضرت علامہ عمر بھر روپیہ جمع نہ کر سکے ۔ اب انھیں اس بات کی فکر لاحق ہو چکی تھی کہ دو چھوٹے بچوں کے لیے زندگی کا کچھ سرو سامان مہیا کریں ۔ اور اس میں سب سے پہلی ضرورت سر چھپانے کے لیے مکان کی تھی ۔ اس کے لیے وہ جد و جہد کر رہے تھے اور ہائی کورٹ میں وکالت کا کام چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ۔ اوپر کے الفاظ اسی صورت حال کی غمازی کر رہے ہیں ۔

۱۷- بارہا ایسا دیکھا گیا کہ شہر اور بیرون شہر کے سیدھے سادے ان پڑھ لوگ آپ کے پاس آ جاتے تو گھنٹوں آپ کی خدمت میں بیٹھے رہتے ۔ آپ خود بھی کھل کر ان سے باتیں کرتے اور ان کی باتیں سنتے بھی ۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جہاں ان کے ہاں بڑے لوگوں کے گرم جوشانہ استقبال کا کوئی اہتمام نہ تھا ، وہاں غریبوں کے لیے آپ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی ۔ ہر شخص آپ تک بہ آسانی پہنچ سکتا تھا اور ایسے لوگوں سے آپ بہت محبت اور اخلاص سے ملتے تھے ۔

۱۸- حضرت علامہ نے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے :

''مسلمانوں کا مغربیت زدہ طبقہ سخت پست فطرت ہے'' ۔ (اقبال نامہ ،

چودھری ظفر اللہ خان صاحب کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ چودھری صاحب اور سر فضل حسین صاحب کے ذریعہ حکومت برطانیہ نے پراونشل آٹانومی کی روح نکال لی ۔ مؤخر الذکر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کا وجود ہمیشہ مسلمانوں کے لیے باعث مضرت رہا ہے اور وقت آ رہا ہے کہ ان کی مزعومہ اسلام دوستی اور مسلم نوازی کے بے حقیقت راز سے پردہ اٹھ جائے[19] ۔

کرنسی آفس کے مسلمانوں کو نماز جمعہ کی اجازت نہ ملنے کا معاملہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ ان کے چند نمائندوں کو میرے پاس لائیں تو میں انھیں مناسب مشورہ دوں گا[20] ۔

ایک موقع پر جاپان کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ جاپان میں تبدیلیٔ مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یورپین ممالک کی طرح صدیوں کا ۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر اسلام کا چرچا جاپان میں شروع ہو گیا تو چند ہفتوں میں پوری جاپانی قوم مسلمان ہو جائے گی ۔ اس کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے ۔ جاپان کے لیے مسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہوگا کہ روس کے خلاف اسے چین اور ترکستان کی

حصہ اول ، ۱۶۹) ۔

ان الفاظ سے بھی حضرت علامہ کی رائے تعلیم یافتہ گروہ کے متعلق صاف ظاہر ہوتی ہے ۔

۱۹ ۔ سر فضل حسین مرحوم پنجاب میں مسلم لیگ کے خلاف ہندو ، مسلمان اور سکھ زمینداروں کی باہمی تنظیم ''یونینسٹ پارٹی'' کے بانی اور زبردست حامی تھے ۔ اس پارٹی نے آخر تک حصول پاکستان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں ۔ تقسیم ملک سے تھوڑی مدت پہلے مسلم لیگ کو یونینسٹ گورنمنٹ کے خلاف جب زبردست جد و جہد کرنی پڑی اور مسلمانوں اور حکومت پنجاب کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہوگئی تو اس وقت حکمران یونینسٹ پارٹی کی قیادت سر خضر حیات خان ٹوانہ کر رہے تھے جو سر سکندر حیات خان کے بعد ان کے جانشین اور یونینسٹ پارٹی کے قائد منتخب ہوئے تھے ۔

۲۰ ۔ کرنسی آفس اس زمانہ میں وہی کام کرتا تھا جو بعد میں ریزرو بینک اور پھر اسٹیٹ بینک کے سپرد ہوا ۔ اس زمانے میں اس دفتر کے سربراہ یعنی کرنسی آفیسر ایک سخت متعصب ہندو مسٹر کالی چرن تھے جو مسلمان عملے کو طرح طرح سے پریشان کرنے کے عادی تھے ۔ ان دنوں وہ مسلمان عملے کو ظہر کی نماز اور نماز جمعہ کی ادائی سے روکا کرتے تھے ۔ بعد میں ان کی شکایت وائسرائے کی مجلس منتظمہ کے فنانس ممبر کو پہنچائی گئی جس کے نتیجے میں تحقیقات کے بعد ان کا تبادلہ لاہور سے کسی دوسری جگہ ہو گیا ۔

زبردست اسلامی قوت کی امداد و حمایت حاصل ہو جائے گی[۲۱] ۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ :

گزشتہ شب میں سیر کرتا ہوا پھر حضرت علامہ کے دولت کدے پر جا نکلا ۔ اس وقت آپ کے پاس قیصر صاحب[۲۲]، استاد عشق لہر[۲۳] اور ایک ''حکیم صاحب''[۲۴] بیٹھے تھے ۔ وہ لوگ دس بجے کے بعد چلے گئے اور میں حضرت علامہ کے ارشادات عالیہ سننے کے لیے اکیلا رہ گیا ۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک بہت ہی پر لطف صحبت رہی ۔ دوران گفتگو یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ یورپ والے جن باتوں کا صدیوں تک تجربہ کرتے رہے اب ان سے متنفر ہو چکے ہیں ۔ یورپ کے ایشیائی مقلدین

۲۱۔ علامہ مرحوم کا یہ خیال تھا کہ کسی بڑی آزاد قوم کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا دنیا میں اسلام کے لیے موجب احیاء ہوگا ۔ اس لیے ان کی یہ آرزو تھی کہ جاپانی یا جرمن ایسی کوئی قوم مسلمان ہو جائے ۔ ان کی یہ آرزو عین منشائے ایزدی کے مطابق تھی اس لیے کہ قرآن میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان اسلام کے لیے جد و جہد کرنے سے احتراز کریں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی اور قوم کھڑی کر دے گا جو اللہ کی راہ میں مارنے اور مرنے سے گریز نہ کرے گی ۔ ہم عصر مسلمان ملکوں اور قوموں کے متعلق بھی حضرت علامہ کی رائے بالعموم اچھی نہ تھی ، اس لیے کہ بیشتر ممالک یا تو مغربی استعمار کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے یا مغربی تمدن کے مقلد ہو چکے تھے ۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جب تک مسلمان قومیں مغربی اقوام کی غلامی سے آزاد نہ ہوں احیائے اسلام کا کام نہیں ہو سکتا ۔ عمر کے آخری حصے میں وہ کھلم کھلا مغرب کے خلاف مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے لگے تھے جیسا کہ ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کے صفحات سے صاف عیاں ہے ۔

۲۲۔ ملک لال دین قیصر لاہور کے مشہور سیاسی کارکن اور پنجابی زبان کے کہنہ مشق شاعر تھے ۔ اکثر تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ۔ لاہور کی ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس برادری نے قبل از تقسیم ملک اور بعد قیام پاکستان بہت سے ممتاز کارکن اور سرکاری افسر مہیا کیے ۔ مثلاً قائد اعظم کی وفات کے بعد ملک غلام محمد صاحب جو پاکستان کے گورنر جنرل ہوئے ، وہ اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے ۔ اسی طرح پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر محمد منیر ، اسٹیٹ بنک کے سابق گورنر مسٹر عبد القادر اور اٹامک انرجی کمیشن کے سابق چیرمین ڈاکٹر نذیر احمد ، سب اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں ۔

۲۳۔ استاد عشق لہر پنجابی زبان کے مشہور و معروف شاعر تھے ۔

۲۴۔ ان حکیم صاحب سے میں واقف نہ تھا اور نہ ان سے اس موقع پر تعارف ہوا ۔

انھیں چیزوں کے پیچھے لگے ہیں ۔ مثلاً عورتوں کی بے مقصد آزادی ۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا : I have no faith in women یعنی مجھے عورتوں پر کوئی اعتماد نہیں ۔۲۵

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں ۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا ہے اس لیے کہ اس کی تخلیقی قوت اس کے رحم سے تعلق رکھتی ہے ۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت رحم سے ۔ جن عورتوں کا رحم اپنا طبعی کام کرتا ہے یعنی جو بچے جنتی ہیں وہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہیں ، بمقابلہ ان عورتوں کے جنھوں نے کبھی بچہ نہیں جنا ۔

۳۰ نومبر ۱۹۳۴ :

گزشتہ یک شنبہ کے روز میں تین چار دوستوں کے ہم راہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ ہم لوگ قریباً دو گھنٹے آپ کی خدمت میں حاضر رہے ۔ علامہ محترم نے سیاسیات ، اقتصادیات ، تصوف ، شریعت سبھی طرح کے مسائل پر حکمت و معرفت کے دریا بہائے ۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کی نا مساعدت اور بخت کی ناموافقت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ افلاس اور فقر سے بھی انسان بے شمار فائدے حاصل کر سکتا ہے ۔ ایک مفلس آدمی جس کے پاس چھن جانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے ، حق و صداقت کی راہ میں وہ دلیری دکھا سکتا ہے جو ایک صاحب مال و زر نہیں دکھا سکتا ۔

پھر آپ نے فرمایا ''میں ملکی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے کے لیے شامل نہ ہوا تھا ، بلکہ محض اس لیے کہ ہندوستان کے آیندہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی حیثیت واضح و متعین کردوں اور یہ ظاہر کردوں کہ اس ملک کے سیاسی ارتقا میں حصہ لیتے ہوئے مسلمانوں کو دوسری قوموں میں مدغم نہ ہو جانا چاہیے'' ۔ آپ نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا کہ ''میں نے گول میز کانفرنس میں

۲۵- اس سے مراد محض یہ تھی کہ قومی زندگی میں قیادت عورتوں کے بس کی چیز نہیں ۔ ورنہ حیات اجتماعی میں عورتوں کے مقام کے متعلق ان کے خیالات عالیہ ان کے کلام میں بہ کثرت ملتے ہیں ۔ ان کے کلام میں جابجا عورت کے فرائض اصلیہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان فرائض میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت عورت کا فریضہ ''امومت'' ہے اور تہذیب حاضرہ کے بد ترین نتائج میں سے عورت کی اولاد سے محرومی ہے ۔ چناں چہ ایک موقع پر اس تہذیب کا خلاصہ آپ کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے :

مرد بے کار ، زن تہی آغوش

اس کے سوا اور کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا" -

تعلیم کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ "مسلمانوں نے دنیا کمانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے - یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں اپنا دین کھو رہی ہیں" -

یکم اپریل ۱۹۳۵ :

کل میں نے حضرت علامہ سے ادب لطیف کی تعریف پوچھی تو آپ نے "ادب" اور "آرٹ" پر اظہار خیال فرمایا - آپ نے ارشاد فرمایا کہ آرٹ کے متعلق دو نظریے ہیں - اول یہ کہ آرٹ کا مقصد محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے - دوم یہ کہ آرٹ انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے - ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے - ہر چیز کو انسانی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس لیے ہر وہ آرٹ جو انسانی زندگی کے لیے مفید ہو جائز ہے اور وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مضر ہو ناجائز ہے - وہ آرٹ جو انسان کی ہمت کو پست اور اس کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابل نفرت ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے -

اس کے بعد حکومت کے فرائض پر اظہار خیال ہوا اور حضرت علامہ نے فرمایا کہ "حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے - لیکن اس سب سے بڑے فرض کو جدید دنیا تسلیم ہی نہیں کرتی - حکومتیں محض سیاسیات سے تعلق رکھتی ہیں اور افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں" -

پھر اسلام اور تہذیب حاضرہ کا ذکر ہوا - فرمانے لگے کہ اسلام تہذیب حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے اس لیے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ ان چیزوں کو جزو اسلام بنا لیا جائے - آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا اب اسلام کی طرف آ رہی ہے - اس لیے اگر آج تہذیب مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہونے کا امکان ہے - جونہی تہذیب مغربی کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیے -

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے ، چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں ان کی موسیقی کا بہت بڑا حصہ رہا ہے -

۲۹ اپریل ۱۹۳۵ :

پرسوں رات حضرت علامہ نے بہت پرجوش باتیں کیں - میں جب بھی ان کی

خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ضبط تحریر میں لے آؤں لیکن یہ اس وقت تو ممکن نہیں ہوتا اور گھر آ کر سب باتیں محفوظ کر لینا میرے بس کی بات نہیں - اس روز آپ نے دوران گفتگو فرمایا :

Character is a kind of energy. The more it is dissipated the weaker it becomes.

(سیرت ایک قسم کی قوت ہے - جتنا اسے بے کار صرف کیا جاتا ہے اتنی ہی یہ کمزور ہو جاتی ہے) -

حضرت علامہ کی رائے میں دنیائے اسلام کی فلاح سلطنت برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے -

۱۲ مئی ۱۹۳۵ :

آج صوفی صاحب[۲۶] ، بدر صاحب[۲۷] اور طارق صاحب[۲۸] پروفیسر منیرالدین صاحب کی طرف جاتے ہوئے میرے ہاں آئے - انھوں نے فرمایا کہ علامہ اقبال کا وہ بیان جو احمدیوں کے متعلق حال ہی میں شائع ہوا ہے ، پمفلٹ[۲۹] کی صورت میں شائع کیا جائے - میں نے وہ بیان پڑھا اور کہا کہ میرے خیال میں یہ بیان بہت مختصر ہے -

۲۳ مئی ۱۹۳۵ :

گزشتہ شام چھ بجے میں اور عزیزم خواجہ عبدالرشید[۳۰] ایک دوست کے ہمراہ

۲۶- صوفی صاحب سے مراد صوفی غلام مصطفٰی تبسم صاحب ہیں جو مدتوں گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے استاد رہے اور پنشن پا کر مختلف قسم کے علمی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں - آج کل ، سنا ہے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہیں -

۲۷- بدر صاحب سے مراد ہمارے مرحوم دوست بدر الدین بدر ہیں جو اس زمانے میں ربن پریس لاہور میں کام کرتے تھے -

۲۸- طارق صاحب سے مراد عبدالرشید طارق صاحب ہیں جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے اور قیام پاکستان کے بعد مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات میں افسر ہو گئے -

۲۹- یہ بیان بعد میں ایک پمفلٹ کی صورت میں مندرجہ ذیل عنوان سے شائع ہوا تھا :

Islam and Qadianism

۳۰- یعنی میرے برادر زادہ لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید جو اس زمانے میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے طالب علم تھے اور اب جناح پوسٹ گریجویٹ

حضرت علامہ کی طرف اس غرض سے گئے کہ ان سے آیندہ اتوار کے روز ملاقات کے لیے وقت لیا جائے[۳۱]۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو علی بخش سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ (والدۂ جاوید) کا ساڑھے پانچ بجے شام انتقال ہو چکا ہے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اس وقت حضرت علامہ کے پاس صرف صوفی تبسم صاحب اور رشید طارق صاحب بیٹھے تھے ۔ ہم لوگ بھی خاموش بیٹھ گئے ۔ رات کے سوا دس بجے جنازہ اٹھایا گیا اور بارہ بجے تدفین سے فراغت ہوئی[۳۲] ۔

۲۵ مئی ۱۹۳۵ :

کل صبح دفتر جانے سے پہلے جاوید منزل تعزیت کے لیے گیا ۔

۱۶ جون ۱۹۳۵ :

کل دفتر[۳۳] میں عارف صاحب[۳۴] نے مجھے ایک رسالہ دیا جو دراصل مرزا بشیرالدین محمود احمد کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کے حالیہ بیانات کے خلاف دیا تھا ۔ آج میں گھر سے دفتر ''اسلام'' جاتے ہوئے راستہ میں حضرت علامہ سے ملا تاکہ وہ رسالہ آپ کو دکھاؤں ۔ وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے ۔ حضرت علامہ نے گفتگو کے دوران میں مجھ سے پوچھا کہ

میڈیکل سینٹر کراچی کے ڈائریکٹر ہیں ۔ ان کی نگارشات سے پاکستان اور ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی روشناس ہے ۔ ان کے متعدد اردو اور انگریزی مضامین مقتدر علمی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔

۳۱۔ بالعموم حضرت علامہ سے ملاقات کے لیے وقت لینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی ۔ البتہ کسی خاص مقصد کے لیے جب ملاقات کرنی ہوتی تھی تو اس لیے پہلے سے وقت لے لیا جاتا تھا تاکہ حضرت علامہ وہ وقت کسی اور کو نہ دے دیں اور متعلقہ معاملے پر گفتگو یکسوئی اور اطمینان سے ہو سکے ۔

۳۲۔ یہ سانحہ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ کو وقوع پذیر ہوا ۔

۳۳۔ دفتر سے مراد ہے قبل از تقسیم ملک کے زمانہ کا دفتر اکوئنٹنٹ جنرل پنجاب ، جہاں میں اس زمانے میں ملازم تھا ۔

۳۴۔ عبدالحمید عارف صاحب ، عبدالمجید سالک مرحوم کے بھائی جو اس زمانے میں اکوئنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں ملازم تھے ۔ یہ صاحب قادیانی ہیں اور بحث مباحثہ کے بڑے شائق ۔

تمہارا پرچہ[۳۵] آیندہ کب چھپے گا ۔ میں نے عرض کیا اس کا دوسرا شمارہ پریس میں جا رہا ہے ، تو انھوں نے فرمایا کہ مرزا صاحب کے جواب میں میرا ایک بیان اس میں شائع کر دو ۔ چنانچہ آپ نے یہ بیان مجھے لکھوایا ۔ پھر خاصی دیر تک اس میں کانٹ چھانٹ ہوئی ۔ اس دوران میں چودھری صاحب[۳۶] اور نیازی صاحب[۳۷] بھی آ گئے تھے ان سے بھی مشورہ ہوتا رہا ۔ اس بیان کے علاوہ حضرت علامہ نے مجھے اپنی اس چٹھی کی ایک نقل بھی دی جو حال ہی میں اسٹیٹسمین[۳۸] میں شائع ہوئی تھی تاکہ اسے بھی ''اسلام'' میں بطور مضمون شائع کر دیا جائے ۔ ساڑھے بارہ بجے وہاں سے اٹھ کر گھر آیا ۔

۱۴ جولائی ۱۹۳۵ :

کل رات علامہ اقبال کے ہاں گیا تو وہاں پیر تاج الدین صاحب مع اپنے دو ساتھیوں کے بیٹھے تھے ۔ تھوڑی دیر میں وہ حضرات چلے گئے تو حضرت علامہ کے اور میرے درمیان باتیں شروع ہوئیں ۔ کچھ دیر کے بعد چودھری محمد حسین صاحب تشریف لے آئے ۔ حضرت علامہ کی تمام گفتگو بڑے دقیق فلسفیانہ موضوعات پر تھی ۔ آپ نے نبوت پر عمومی اور نبوت محمدیہ پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی ۔ حضرت علامہ کا پختہ خیال ہے کہ نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو ابھی تک انسان نہیں سمجھا ۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بزرگان سلف بھی اس کی کنہ کو نہیں پہنچے ۔ وہ مدعی تھے کہ خود ان کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے اور اس موضوع پر وہ تفصیل سے اپنی مجوزہ کتاب ''تمہیدالقرآن'' میں روشنی ڈالیں گے ۔

۳۵۔ اس سے مراد انجمن خدام الدین (شیراں والا دروازہ) لاہور کا پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''اسلام'' ہے جو ابھی ابھی نکلنا شروع ہوا تھا ، اور جس کے ادارتی فرائض میں انجام دیتا تھا ۔ یہ پرچہ ۱۹۳۵ سے ۱۹۳۹ تک باالالتزام نکلتا رہا ۔ میں چونکہ سرکاری ملازم تھا اس لیے پرچے کا ڈیکلریشن خواجہ محمد رشید وائیں صاحب کے نام سے تھا جو لاہور کی مشہور ''آسٹریلین فیملی'' کے رکن ہیں ۔ اسی پرچے میں حضرت علامہ کا معرکہ آرا مضمون Islam and Ahmadism (اسلام اور احمدیت) اول بار شائع ہوا تھا ۔ جنگ عظیم ثانی کے شروع ہی میں یہ پرچہ بند کر دینا پڑا ۔

۳۶۔ خان بہادر چودھری محمد حسین صاحب جو اس زمانے میں حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر تھے اور جن کو علامہ مرحوم سے خصوصی تعلق تھا ۔

۳۷۔ سید نذیر نیازی صاحب جن سے محبان اقبال بخوبی واقف ہیں ۔

۳۸۔ حضرت علامہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان اس زمانے میں احمدیوں کے متعلق خط و کتابت اس روزنامے میں چھپتی رہی تھی ۔

۱۶ جولائی ۱۹۳۵ :

کل شام میں اتفاقاً حضرت علامہ کے ہاں جب گیا تو خلاف معمول[۳۹] وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں گرگابی تھی اور قریب ہی کرسی پر کوٹ اور ٹوپی بھی پڑی تھی ۔ میں سمجھا کہ آج کہیں باہر جانا ہوا ہوگا لیکن معلوم ہوا کہ آپ اس وقت بھوپال جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بھوپال سے واپسی تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد ہوگی ۔

۳ دسمبر ۱۹۳۵ :

آج حضرت استاذی المحترم مولانا احمد علی صاحب کے فرزند اکبر مولوی حافظ حبیب اللہ صاحب کے ہمراہ حضرت علامہ کی خدمت میں طویل مدت کے بعد حاضر ہوا ۔ گھنٹے سوا گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں اور زیادہ تر موضوع گفتگو تصوف رہا ۔

•

۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ :

آج پھر حافظ حبیب اللہ صاحب[۴۰] کی معیت میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو چھڑ گئی ۔ میں نے پوچھا کہ جہاد دفاعی ہونا چاہیے یا جارحانہ ۔ فرمایا کہ عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے ۔ مثلاً اگر کوئی قوم بد اخلاق میں اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے دنیا میں نسل انسانی کی تباہی کا امکان ہو تو مسلمان حکومتوں کا فرض ہے کہ بزور شمشیر اس قوم کو بد اخلاق سے روکیں ۔ چنانچہ سلطان ٹیپو نے مالا بار کے وحشی باشندوں کو حکم دیا کہ بجائے برہنہ رہنے کے کپڑے پہننا شروع کر دیں ورنہ وہ بزور شمشیر انھیں کپڑے پہننے پر مجبور کرے گا ، اس لیے کہ ان کی برہنگی کا اثر ہمسایہ قوموں کے لوگوں پر ہوگا ، اور ان میں مسلمان بھی شامل ہیں ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کو ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا حکم دیا گیا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے طاقت کی حمایت ہونی چاہیے ، ورنہ بغیر طاقت کے ''امر و نہی'' کیسے ممکن ہے ۔ اگر مسلمان ''امر و نہی'' کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے

۳۹۔ خلاف معمول اس لیے کہ گرمیوں کے موسم میں بالعموم حضرت علامہ گھر پر لنگی اور بنیان میں ملبوس رہنے کے عادی تھے ۔

۴۰۔ محترمی حافظ حبیب اللہ صاحب بعد میں ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے اور آج تک وہیں ہیں ۔ اب سننے میں آیا ہے کہ انھوں نے قیام مکہ مکرمہ میں فرما لیا ہے ۔

بازوؤں میں طاقت[۴۱] ہونا ضروری ہے۔

۱۹ جنوری، ۱۹۳۶ :

گزشتہ دو ہفتے سے میں اس کوشش میں تھا کہ حضرت علامہ کا وہ انگریزی بیان جو پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین مطبوعہ ''ماڈرن ریویو'' کے لیے لکھا گیا تھا، انجمن خدام الدین کی طرف سے شائع ہو۔ الحمد للہ کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور یہ بیان Islam and Ahmadism (اسلام اور احمدیت) کے عنوان سے ''اسلام'' کے پرچے بابت ۲۲ جنوری، ۱۹۳۶ میں چھوٹی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر شائع ہو گیا۔[۴۲] اس شمارے میں تمام تر وہی مضمون چھپا ہے دوسری اور کوئی چیز نہیں۔ اس مضمون میں احمدیت کے متعلق بہت سے اہم

۴۱۔ حضرت علامہ کی تمام کتابوں میں ''جہاد'' پر زور دیا گیا ہے اور جہاد کے لیے طاقت مہیا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر تو آپ نے یہاں تک فرما دیا کہ:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

۴۲۔ حضرت علامہ کے اس مضمون کی اشاعت کا معاملہ خاصا دلچسپ ہے۔ یہ مضمون میں نے خود ٹائپ کیا اور جب میں یہ لے کر حضرت علامہ کے پاس گیا تو آپ نے میرا قلم جس میں سبز روشنائی بھری ہوئی تھی، مجھ سے لے کر اس میں کانٹ چھانٹ شروع کی اور ہر صفحے پر کثرت سے تغیر و تبدل کر دیا۔ بعض جگہ بہت بڑا حصہ کاٹ کر اس کی جگہ حاشیے پر نیا مواد درج فرما دیا اور بعض جگہ پورا صفحہ کاٹ کر پشت پر نیا مواد درج فرما دیا اور مضمون کے آخر میں یہ الفاظ درج فرمائے:

I authorise the Anjuman Khuddamuddin to publish the above in the form of a pamphlet for free circulation.

یعنی ''میں انجمن خدام الدین کو مندرجہ بالا مضمون ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کرنے کا اختیار سونپتا ہوں، جو مفت تقسیم ہوگا۔''

اس کے نیچے حضرت علامہ نے اپنے دستخط مع تاریخ ثبت فرما دیے۔ ''اسلام'' کا یہ شمارہ تیار ہو جانے کے بعد ایک نیا ٹائیٹل لگا کر اس مضمون کو پمفلٹ کی صورت دے دی گئی جسے حضرت علامہ نے پسند فرمایا۔

حضرت علامہ کے اپنے ہاتھوں سے ترمیم کردہ اصل ٹائپ شدہ مضمون میرے پاس محفوظ پڑا رہا۔ بارہا یہ مضمون احباب لے گئے لیکن پھر واپس آ گیا۔ آخری مرتبہ احرار کے مشہور رہنما حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم کے پاس دو تین برس یہ مضمون پڑا رہا اور پھر وہ خود ہی کراچی آ کر میرے مکان پر چھوڑ گئے۔ پندرہ بیس برس کے بعد ربوہ کے قادیانی پرچے ''الفضل'' میں ایک طویل سلسلہ مقالات افتتاحیہ کا شائع ہوا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ

حقائق واضح کیے گئے ہیں ۔ بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ آج تک احمدیت پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے مقابلے میں اس مضمون سے احمدیت پر بڑی زبردست ضرب لگی ہے ۔ اس مضمون کی اشاعت نے واقعی احمدیوں کو بوکھلا دیا ہے ۔

یہ مضمون اقبال کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ جعلی ہے ۔ اور اندرونی شہادتوں سے اس دعوے کی تصدیق کی ناکام کوشش کی گئی ۔ اس پر میں نے اپنے پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''الاسلام'' میں جو میں کراچی سے تقریباً دس برس تک شائع کرتا رہا ہوں ۔ ایک مضمون صفحہ اول پر شائع کیا اور یہ واضح کیا کہ اس مضمون کا اصل مسودہ (Typescript) میرے پاس اب تک محفوظ ہے جس کے آخر میں حضرت علامہ کے دستخط مع تاریخ موجود ہیں ۔ چنانچہ میں نے اس کے آخری صفحے کا عکس بھی ''الاسلام'' کے صفحہ اول پر چھاپ دیا ۔ اس کے بعد قادیانیوں کو خاموشی اختیار کر لینا پڑی ۔

اس مضمون کا اصل مسودہ (Typescript) اقبال اکادمی کراچی نے مجھ سے حاصل کر لیا تھا اب یہ بمد امانت کراچی نیشنل میوزیم میں محفوظ پڑا ہے ۔

سب سے بڑی دلیل جو ''الفضل'' کے مقالات میں اس مضمون کے خلاف دی گئی یہ تھی کہ حضرت علامہ ایک مدت تک مرزا غلام احمد اور ان کی تحریک کے حامی رہے ہیں ۔ لیکن اس دلیل میں کچھ وزن نہیں ، اس لیے کہ گو یہ دعویٰ صحیح ہے لیکن مدت العمر کے غور و فکر کے بعد حضرت علامہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ابدی غلامی کی الہامی سند مہیا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی ۔ اس لیے انھوں نے بالآخر اس کے خلاف شدید قلمی جہاد کیا ۔

اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز قابل لحاظ ہے کہ خود مرزا غلام احمد ایک مدت تک اپنے نبی ہونے کا انکار کرتے رہے کہ

من نیستم رسول و نیاوردہ ام کتاب

بلکہ اپنی ایک کتاب میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''میں بھی عام مسلمانوں کی طرح یہ مانتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں لیکن وحی الٰہی نے بارہ برس تک بارش کی طرح نازل ہو کر مجھے یقین دلا دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام مر گئے ہیں'' ۔

ظاہر ہے کہ اگر مرزا صاحب کے خیالات میں اس قسم کا بنیادی تغیر آسکتا ہے اور وہ بھی بارہ برس کے بعد ، تو حضرت علامہ نے تو کبھی دعویٰ نبوت نہیں کیا ، ان کے خیالات میں اگر تغیر ہوا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ؟

۱۲ ، جون ۱۹۳۶ :

پرسوں صبح دفتر[۴۳] کے ریفریشمنٹ روم میں شیخ محمد دین صاحب شرقپوری[۴۴] نے مجھ سے کہا کہ پنجاب پی ۔ ڈبلیو ۔ ڈی سکریٹریٹ کے ایک عیسائی سپرنٹنڈنٹ مسٹر جے ۔ اراٹون (Mr. J. Arratoon) مائل بہ اسلام ہیں ۔ ان سے ملیے ۔ بعد میں دو آدمی مولانا مظہر علی اظہر[۴۵] کی چٹھی لے کر میرے پاس آ گئے جس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ آج ہی مسٹر اراٹون سے ملنا چاہیے، مبادا غلط قسم کے حضرات ان تک پہنچ جائیں ۔ میں نے اسی وقت ایک رقعہ مسٹر اراٹون کے نام ان حضرات کے ہاتھ بھیجا جس میں ان کو دعوت دی کہ وہ (مسٹر اراٹون) کل ساڑھے پانچ بجے سہ پہر میرے مکان پر چائے نوش فرمائیں ۔ انھوں نے میری دعوت قبول فرما لی ، اور کل وہ میرے دفتر کے دو تین مسلمان رفقاء کے ہمراہ چائے نوشی کے لیے تشریف لے آئے ۔ میرے چند دوست بھی مدعو تھے ۔ اراٹون صاحب فوراً مشرف بہ اسلام ہونے پر آمادہ ہو گئے ۔ چنانچہ اسی وقت ہم سب لوگ انھیں ہمراہ لے کر حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں ''جاوید منزل'' حاضر ہوئے ۔ وہاں راجہ حسن اختر صاحب اور سید نذیر نیازی صاحب موجود تھے ۔ حضرت علامہ سے ہم لوگوں نے اپنی حاضری کا باعث بیان کیا ۔ حضرت مولانا عبدالحنان[۴۶] صاحب کو وہیں بلا لیا گیا اور انھوں نے اراٹون صاحب کو

۴۳۔ مراد اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کا دفتر ہے جہاں کے مسلمان اس زمانے میں ہر طرح کے دینی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لیا کرتے تھے ۔ اس دفتر کے لوگوں میں سے بہت سے کارکن انجمن حمایت اسلام لاہور کو میسر آئے ۔ انجمن کے فنانشل سکریٹری بیشتر اسی دفتر کے لوگ رہے ۔ منشی نظام الدین صاحب ، حاجی محمد حفیظ صاحب ، خان عبدالرحمان خان صاحب ، یہ سب لوگ یہیں ملازم تھے اور عمر بھر انجمن کی خدمت کرتے رہے ۔ آج انجمن کے آنریری فنانشل سکریٹری خواجہ غلام دستگیر صاحب بھی اس دفتر سے ریٹائر ہونے والے اصحاب میں سے ہیں ۔

۴۴۔ شیخ محمد دین صاحب شرق پوری بہت مخلص ، دیندار اور محنتی نوجوانوں میں سے تھے اور میرے دفتر کے ساتھیوں میں سے تھے ۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں ۔

۴۵۔ مولانا مظہر علی اظہر بزرگان ''مجلس احرار'' میں سے ہیں ۔ تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں ۔ قید و بند کے خطرے نے انھیں کبھی اعلان حق سے نہیں روکا ۔ بڑے ہی مخلص بزرگ ہیں ۔ اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے ۔ مجھے دین کی خدمت کے سلسلے میں ان کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا ۔ مجلس احرار پنجاب کے چوٹی کے راہنماؤں میں سے اب یہی ایک بقید حیات ہیں ۔

۴۶۔ حضرت مولانا عبدالحنان صاحب اس زمانے میں آسٹریلیا مسجد لزد لاہور ریلوے اسٹیشن میں خطیب تھے ۔ آپ ہمیشہ تبلیغی کاموں میں اور جہاد آزادی میں پیش پیش رہے اور ہر قسم کی قربانیاں خندہ پیشانی سے دیتے رہے ۔

مشرف بہ اسلام کر لیا ۔ الحمد للہ علی ذالک[۳۷] ۔ شام کے بعد ہم لوگوں نے اس واقعہ کی اطلاع مسلمان اخباروں میں اشاعت کے لیے پہنچا دی ۔ اراٹون صاحب کا اسلامی نام ''جمیل'' رکھا گیا ۔ آج وہ نماز جمعہ شاہی مسجد میں ادا فرمائیں گے ۔

میں سوچتا ہوں کہ آج جو کچھ ترقی اسلام کی ہو رہی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو رہی ہے ۔ اس میں مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں کا کچھ دخل نہیں ہے ۔ اگر ہم مسلمان تبلیغ کا کام باقاعدگی کے ساتھ کریں تو اسلام کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو سکتی ہے ۔ ابھی چند روز ہوئے گاندھی جی کا فرزند اکبر ہیرا لال مسلمان ہوا تھا ۔

۲۷ اکتوبر ، ۱۹۳۶ :

گزشتہ شنبہ کے روز حضرت علامہ کی ایک نظم[۳۸] روز نامہ ''احسان''[۳۹] کے سالنامے میں شائع ہوئی جو مجھے بہت ہی پسند آئی ۔ فرماتے ہیں :

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس　　قسمت مردانِ آزاد است و بس
مرد آزادے چو آید در سجود　　در طوافش گرم رو چرخ کبود
ما غلامان از جلالش بے خبر　　از جمال لازوالش بے خبر

۳۷- اس وقت ایک اعلان مسٹر اراٹون کی طرف سے ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا تیار کیا گیا جس میں ان کے دستخط کے نیچے تمام حاضرین نے بطور شہادت اپنے اپنے دستخط ثبت فرما دیے ۔ ان دستخط کنندگان میں حضرت علامہ مرحوم بھی شامل تھے ۔ یہ کاغذ آج تک محفوظ ہے اور اقبال اکادمی کراچی کے ریکارڈ میں شامل ہے ۔

۳۸- یہ نظم بعد میں شائع ہونے والی کتاب ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کا ایک بند تھا ۔

۳۹- روز نامہ ''احسان'' حضرت علامہ مرحوم کی توجہات کا ہمیشہ مرکز رہا ۔ آپ کے بیشتر خصوصی اعلانات اسی اخبار میں شائع ہوئے ۔ ان اعلانات میں سے دو بہت اہم ہیں ۔ اول مسجد شہید گنج کے بارے میں ، جس کا قصہ بہت دلچسپ ہے ۔ مسجد شہید گنج ایک تاریخی مسجد لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لنڈا بازار کے شروع میں واقع تھی جس پر سکھوں کا قبضہ تھا ۔ مسلمانوں نے اس کی واگزاری کے لیے قانونی چارہ جوئی کی ۔ اس مقدمے میں ، جب وہ ہائی کورٹ میں پیش تھا ، قائداعظم مرحوم نے مسلمانوں کی طرف سے پیروی کی تھی ۔ جب ہائی کورٹ نے مسلمانوں کی اپیل خارج کر دی تو لاہور کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا ۔ ایک روز اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ علامہ اقبال کے مکان پر ایک جلسے میں یہ طے ہوا ہے کہ مسجد شہید گنج کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کی جائے ۔ اس کے لیے تیس ہزار روپیہ

در بدن داری اگر سوز حیات ہست معراج مسلماں در صلواۃ
ور نداری خون گرم اندر بدن سجدۂ تو نیست جز رسم کہن
عید آزادان شکوہ ملک و دیں عید محکوماں ہجوم مومنیں

درکار ہوگا ۔ لہٰذا مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ یہ رقم مہیا کر دیں ۔ اس اعلان پر چار بزرگوں کے نام تھے : (۱) نواب ممدوٹ (۲) خان سعادت علی خاں (۳) خان بہادر حاجی رحیم بخش ریٹائرڈ سشن جج (۴) خان بہادر نواب مظفر خان صاحب ۔ ان میں سے ہر ایک تیس ہزار کی رقم بآسانی اپنی جیب سے ادا کر سکتا تھا ۔ لیکن مقصد یہ تھا کہ روپیہ غریبوں کی جیبوں سے نکلے اور نیک نامی خود ان بزرگوں کو حاصل ہو ۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی دلچسپ ہے کہ جب مسجد گرائی گئی تھی تو اس زمانے میں نواب مظفر خان صاحب گورنر پنجاب کی انتظامیہ کونسل کے رکن تھے ۔ ظاہر ہے کہ نواب صاحب کے سامنے کونسل میں یہ معاملہ پیش ہوا ہوگا اور وہیں یہ فیصلہ ہوا ہوگا کہ مسجد گرا دی جائے ۔ چنانچہ مسجد گرانے کے لیے سرکاری بل ڈوزر وغیرہ استعمال ہوئے ۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس وقت نواب مظفر خاں صاحب نے کیا رائے دی تھی ۔ آیا وہ مسجد گرانے کے حق میں تھے یا مخالف ۔ یہ معاملہ آخر تک معرض اخفا میں رہا ۔ بہرحال اگلے روز علامہ مرحوم کا ایک بیان روزنامہ ''احسان'' میں چھپا جس کا ملخص یہ تھا کہ جلسہ میرے مکان پر ضرور ہوا تھا لیکن میں پریوی کونسل میں اپیل کرنے کے خلاف تھا ۔ میں نے یہ خیال ظاہر کر دیا کہ اس اپیل کے دائر کرنے سے مسلمانوں کا تیس ہزار روپیہ ضائع ہوگا ، لیکن اعلان کرنے والے حضرات مصر ہوئے کہ اپیل ضرور ہونی چاہیے ۔ اس پر میں اظہار برأت کے لیے محفل سے اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا (جلسہ ''جاوید منزل'' کے صحن میں ہو رہا تھا) ان لوگوں نے میرے اٹھ جانے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ اپیل ہوگی اور مسلمانوں سے تیس ہزار روپیہ طلب کیا جائے اور رات ہی کو اخبارات میں اعلان کر دیا ۔ میں اس فیصلہ میں شریک نہیں تھا اور اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ یہ اپیل بے کار ہوگی اور غریب مسلمانوں کا تیس ہزار روپیہ ضائع ہوگا ۔

دوسرا واقعہ یوں ہوا کہ دہلی کے ایک پبلک جلسے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جملہ فرمایا تھا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''۔ اس پر مسلم لیگی پریس نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ۔ جس طریق سے اس خبر کو چھاپا گیا اس سے متاثر ہو کر حضرت علامہ مرحوم نے ایک مختصر لیکن بہت ہی زور دار نظم ارقام فرمائی جس کا اخبارات میں بہت چرچا ہوا ۔ اس پر مسلم لیگیوں اور حضرت مولانا مرحوم کے طرف داروں میں زبردست مباحثہ ہوا ۔ بالآخر حضرت علامہ مرحوم کا ایک بیان روز نامہ ''احسان'' میں شائع ہوا جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ چونکہ مولانا نے واضح فرما دیا ہے کہ انھوں نے

۴ نومبر ۱۹۳۶ :

حضرت علامہ کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' شائع ہو گئی ہے ۔[50] میں نے ''اسلام'' کے آیندہ پرچہ کے لیے اس پر ریویو لکھا ہے جس میں قریباً چالیس اشعار نقل کیے ہیں ۔

قادیانیوں کے اردو رسالہ ''ریویو آف ریلیجیز'' میں حضرت علامہ کی کتاب ''ضرب کلیم'' پر پچھلے دنوں ریویو کیا گیا تھا ، جس میں کہا گیا تھا کہ ''یہ کتاب بال جبریل سے بھی گری ہوئی ہے'' ۔ میں نے وہ پرچہ حسرت صاحب[51] کو دیا ۔ انھوں نے ''مطائبات'' میں اس تنقید کا خوب مذاق اڑایا ۔ طارق صاحب[52] نے ''ریویو آف ریلیجز'' کے جواب میں ایک مضمون لکھا جسے لے کر وہ میرے پاس آئے تاکہ میں اسے اپنے پندرہ روزہ انگریزی پرچہ ''اسلام'' میں شائع کر دوں ۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۶ :

''اسلام'' کے تازہ شمارے میں[53] مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' پر میرا تبصرہ شائع ہو گیا ہے ۔

''اوطان'' والا جملہ خبر کے طور پر کہا تھا نہ کہ اپنی رائے کے طور پر ، اس لیے اب میرے اور ان کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں رہا اور آخر میں حضرت علامہ نے مولانا کے شاگردوں سے یہ فرمایا کہ ''مولانا کی عقیدت میں میں ان سے پیچھے نہیں ہوں''۔ اس تمام معاملے کے بعد آج تک اس قصے کو اچھالا جا رہا ہے - میرا یہ خیال ہے کہ ''ارمغان حجاز'' اگر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی زندگی میں چھپتی تو یہ نظم اس میں شامل نہ ہوتی ۔

۵۰- حضرت علامہ کی زندگی میں ان کی شائع ہونے والی کتابوں میں یہ آخری کتاب تھی ۔ ''ارمغان حجاز'' آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی ۔

۵۱- مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم جو اس زمانے میں ہفتہوار ''شیرازہ'' کی ادارت فرماتے تھے اور روزنامہ ''زمیندار'' کے لیے ''مطائبات'' کا کالم لکھتے تھے ۔

۵۲- عبدالرشید طارق صاحب ۔

۵۳- بابت ۷ مئی ، ۱۹۳۶ -

اقبال اور شاہ ہمدان

محمد ریاض*

شاہ ہمدان کا ذکر اقبال نے صرف ''جاوید نامہ'' (۱۸۴ - ۱۹۲) میں کیا ہے اور وہیں شاہ صاحب کی سب سے ضخیم کتاب ''ذخیرۃ الملوک'' کی طرف ایک شعر میں اشارہ بھی کیا ہے[1] ۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب کا موضوع ذکر اُن خاص شخصیتوں میں ادا کیا گیا ہے جو ''جاوید نامہ'' کے لیے مخصوص رہی ہیں اور جن کا ذکر اقبال کی کسی اور تصنیف میں نہیں ملتا مثلاً سعید حلیم پاشا ، کچنر ، مہدی سوڈانی ، طاہرہ ، شرف النساء بیگم اور ناصر خسرو علوی وغیرہ ۔

اقبال کے ان اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی نہ فقط مذکورہ بالا کتاب ، بلکہ کئی دیگر کتابیں بھی امعانِ نظر سے مطالعہ کی تھیں اور وہ ، اُن کی ہمہ گیر شخصیت اور تعلیمات سے بے حد متاثر تھے ۔ پھر شاہ صاحب کی فعال اور مصروفِ کار زندگی میں اقبال کو بے پناہ کشش محسوس ہوئی اور شاہ ہمدان کی بصیرت افروز تعلیمات کا نچوڑ جس پختگی اور اعجازِ بیان سے اپنے اشعار میں سمو دیا ہے ، اسے بیان کرنا مشکل ہے ۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے شاہ صاحب کی تعلیمات اور خاص کر اقبال پر ان تعلیمات کے اثرات سے ابھی تک کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے ۔ مجھے چونکہ دونوں بزرگوں کی گراں بہا تالیفات اور تعلیمات سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے اس لیے یہ بحث چھیڑنے کی جسارت کی ہے ۔ اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے مختصر حالات زندگی بیان کیے جائیں کیوں کہ باوجود اُن کی شہرت کے ، ہمارے ہاں اہلِ علم کا ایک محدود طبقہ ہی اُن کی زندگی اور کارناموں سے آگاہ ہے ۔

شاہ ہمدان کا پورا نام میر سید علی ہمدانی ہے ۔ امیر کبیر ، علی ثانی اور

* محمد ریاض ، ریسرچ اسکالر ، تہران یونی ورسٹی ۔

۱۔ مرشد معنی نگاہان بودہ ای ''محرم اسرار شاہان'' بودہ ای
جاوید نامہ ، ۱۹۲ ۔

شاہ ہمدان اُن کے معروف القاب ہیں ۔ یہ آخری لقب ہی کشمیر اور برصغیر میں زیادہ مشہور ہے اور اس لیے اقبال نے ''امیر کبیر'' کو ایک جگہ نام کے ساتھ لکھا ہے اور باقی ہر جگہ ''شاہِ ہمدان'' کے لقب سے ہی اُن کو یاد کیا ہے ۔

آپ کی ولادت ۱۲ رجب ۷۱۴ ھجری (۲۱ اکتوبر ۱۳۱۴ عیسوی) کو ہمدان میں ہوئی ۔ آپ حسینی سید تھے اور ہمدان میں آپ کے خاندان کو بڑا اقتدار حاصل تھا ۔ ان کے والد سید شہاب الدین ہمدان کے حاکم تھے اور سمنان کے حاکم (اور بعد میں وادیٔ عرفان کے معروف عارف) سید علاءالدولہ سمنانی (وفات ۷۳۶ ھجری) ان کے ماموں اور مربی تھے ۔ شاہ صاحب نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر مروجہ علوم دین میں تبحر حاصل کیا ۔ علوم معقول اور منقول میں بھی آپ نے دسترس حاصل کی ۔ ۱۲ برس کی عمر سے ہی وادیٔ سلوک میں قدم رکھا ۔ اخی علی دوستی (وفات ۷۳۳ یا ۷۳۴ ھ) اور شیخ محمود مزدقانی (وفات ۷۶۶ھ) سے روحانی اور باطنی فیض حاصل کیا ۔ شاہ صاحب کا تعلق سہروردیہ کی ایک شاخ کبرویہ سے ہے جن کا سلسلہ شیخ نجم الدین الکبریٰ (وفات ۶۱۸ھ) سے جا ملتا ہے ۔

شاہ صاحب نے تبلیغی اور تعلیمی اغراض کی خاطر طولانی سفر کیے ۔ انھوں نے تقریباً تمام اسلامی ممالک اور کچھ غیر مسلم ممالک کی تین بار سیاحت کی اور عجیب و غریب واقعات اور حوادث سے دو چار ہوئے ۔ ان سیاحتوں کا بیس سالہ دور جوانی میں اور تیرہ سالہ دور کہولت میں کٹا ۔ کاش وہ اپنا سفر نامہ لکھتے اور وہ یقیناً اُن کے معاصر ابن بطوطہ مراکشی (۷۰۴ - ۷۷۹ھ) کے سفر نامہ سے کم اہمیت کا حامل نہ ہوتا ۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابن بطوطہ اور اُن کو کئی مشترک حوادث کا سامنا کرنا پڑا[۲] ۔

شاہ صاحب نے تقریباً ۴۰ برس کی عمر میں عائلی زندگی اختیار کی ۔ اُن کے ایک صاحبزادے (میر سید محمد ہمدانی) اور ایک صاحبزادی کا ذکر ملتا ہے ۔ صاحبزادی اُن کے معروف مرید سید اسحاق ختلانی (وفات ۸۲۶ھ) کے عقد میں تھیں ۔ پہلے سفر کے بعد کچھ عرصہ ہمدان میں رہے اور پھر شاہ صاحب ختلان (موجودہ کولاب ، تاجیکستان ، سویٹ یونین) چلے گئے ۔ وہاں خلقِ خدا کی رہبری فرماتے رہے یہاں تک کہ ۷۷۴ھ میں تیمور کی تہدید سے مجبور ہو کر ۷۰۰ سادات کو ساتھ لے کر کشمیر میں ہجرت فرمائی ۔ سید صاحب ۷۷۴ھ میں اس سے پہلے بھی (سفر کے دوران) کشمیر کی سیاحت فرما چکے تھے ۔

۲- مثلاً جزائر مالدیو کے واقعات جن کی طرف آگے اشارہ کیا گیا ہے ۔

شاہ صاحب ایک زبردست واعظ ، مبلغ ، مصلح اور حق گو عالم دین تھے ۔ اُن کا شمار کبار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اور سینکڑوں کرامات ان سے سرزد ہوئی ہیں ۔ ہمدان ، ختلان ، کشمیر اور نواحی علاقوں میں ان کے دم سے اسلام کو تقویت ملی ۔ مدارس ، خانقاہ اور لنگر کھولے گئے اور خاص کر کشمیر کی کایا کو انھوں نے ہی پلٹا ۔

شاہ صاحب ایک نابغہ تھے ۔ عربی اور فارسی میں اُن کی ۱۷۰ تصانیف بتائی جاتی ہیں[۳] اور راقم الحروف فی‌الحال سو کے لگ بھگ تصانیف کا مطالعہ کر چکا ہے ۔ ایک سے ایک فکرزا اور ایمان افزا ہے ۔ وہ شاعر بھی تھے اور اوسط درجے کے صوفیانہ اشعار اُن کی یادگار ہیں ۔ شاہ صاحب کی تقریباً دس کتابیں اب تک شائع ہو پائی ہیں اور بقیہ خطی نسخوں کی شکل میں ہیں البتہ اب محقق حضرات ان کتابوں کو بروئے کار لانے کی فکر میں ہیں ، ایدھم اللہ ۔

شاہ صاحب کی وفات ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ (۱۹ جنوری ۱۳۸۴ع) کو سفر کے دوران تحصیل مانسہرہ (ضلع ہزارہ) کے ایک مقام "پکھلی" کے قریب ہوئی اور اُن کی وصیت کے مطابق مریدوں نے نعشِ مبارک کو مذکورہ ختلان میں دفن کیا جہاں مقبرہ موجود ہے اور اسی مقبرہ میں ان کے خاندان کے دس اور سادات مدفون ہیں[۴] ۔

اقبال نے اپنے شاہکار آسمانی سفر (جاوید نامہ) میں شاہ صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر "آنسوئے افلاک" کیا ہے ۔ حسبِ معمول علامہ کے رہنما مولانا جلال الدین رومی ، غنی کشمیری اور شاہ صاحب کا تعارف کرواتے ہیں ۔ یہ سات اشعار جن میں شاہ صاحب اور اُن کی تعلیماتِ حقہ کا تعارف ہے ، ملاحظہ ہوں :

نغمۂ می خواند آن مستِ مدام	در حضور سید والا مقام
سید السادات ، سالارِ عجم	دستِ او معمار تقدیر اُمم
تا غزالی درس "اللہ ھو" گرفت	ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
مرشد آن کشور مینو نظیر	میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطہ را آن شاہِ دریا آستین	داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آن مرد "ایرانِ صغیر"	باہنرہای غریب و دل پذیر

۳- حاجی مسکین امرتسری ، تحایف الابرار یا تاریخ کبیر ۔

۴- Dr. Sufi, Kashir, I, 116 c-d.

یک نگاہِ او گشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہی بدہ

ان اشعار میں شاہ صاحب کی وہ خدمات بیان کی ہیں جو انھوں نے کشمیر میں انجام دیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی نمایاں ترین خدمات یہیں بارور ہوئیں اور اسی خاطر اُن کو حواریٔ کشمیر (The Apostle of Kashmir) کہا جاتا ہے[۵] ۔ اب علامہ کے ان اشعار کے اشارات ملاحظہ ہوں :

پہلے شعر میں غنی کشمیری (وفات غالباً ۱۰۷۷ھ) کو جو دربار شاہ ہمدان یعنی گوشۂ جنت میں نغمہ سرا دکھایا ہے وہ غنی کی اُس عقیدت کی غماضی کی خاطر ہے جو اُسے شاہ صاحب سے زندگی بھر رہی ۔ غنی کے آبا و اجداد ترکستان سے شاہ صاحب کے ساتھ مہاجرت کرکے کشمیر وارد ہوئے تھے[۶] اور اسلامی تہذیب و تمدن نیز فارسی زبان و ادب کا جو عروج غنی اپنی زندگی میں دیکھ رہا تھا اسے وہاں شاہ صاحب نے ہی رواج دیا تھا اور پھر طبعاً بھی غنی ''فقر او ظاہر غنی ، باطن غنی'' کا مصداق تھا اور اسی مناسبت سے وہ شاہ صاحب کے ہاں نغمہ سرائی کا مجاز تھا ۔

دوسرے شعر میں شاہ صاحب کو سید السادات اور سالار عجم اور معمار تقدیر امم کے خطابات سے یاد کیا گیا ہے جن میں مطلق مبالغہ نہیں ہے ۔ شاہ صاحب نے امیر تیمور کی تہدید[۷] کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمدان ، بدخشان اور ختلان وغیرہ کے ۷۰۰ سادات جمع کیے اور سلطان شہاب الدین (۷۵۵ - ۷۷۵ھ) سے رابطہ قائم کرکے کشمیر کی راہ لی ۔ اتنے قافلۂ سادات کے وہ قائد بنے اور ان سب کو کشمیر میں اس طرح آباد کروایا کہ دین کی خدمت بھی کر سکیں اور دوسروں پر بوجھ بھی نہ بنیں ۔ ان میں سے کئی کو بطور مبلغِ دین تیار کیا اور دین اسلام کو بغیر کسی خونریزی اور فساد کے پھیلایا ۔ اُن کی مساعی سے کشمیر کا نومسلمان اور متزلزل معاشرہ ، مستحکم ہو گیا اور ۳۷ ہزار کشمیریوں کی تقدیر شاہ صاحب کے دستِ مبارک پر بدل گئی (یعنی اتنی تعداد نے کفر ترک کیا اور اسلام قبول کیا[۸]) ۔ اُن کے فیضان کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے ایک مرتبہ سلطان قطب الدین (۷۷۵ - ۷۹۵ھ) کو اپنی

۵- Ibid, 84 اور Ency. of Islam, I, 392 ۔

۶- تاریخ حسن II و ''کشمیر ہمارا ہے'' ص ۸۷ ۔

۷- امیر تیمور شاہ صاحب کی حق گوئی اور ان سادات کے اثر و رسوخ سے ناراض تھا اور ان سب کو تہ تیغ کرنا چاہتا تھا ۔

۸- آب کوثر ، طبع پنجم ، ۳۷۷ ۔

ٹوپی عنایت فرمائی اور اس عقیدت مند سلطان اور اس کے جانشینوں نے اسے ہمیشہ اپنے تاج کے لیجے پہنا مگر سلطان فتح شاہ (وفات ۹۲۲ھ) نے اسے لاش کے ساتھ دفن کر دینے کی وصیت کی ۔ اس کے دفن ہو جانے پر شاہ صاحب نے کسی بزرگ کو خواب میں فرمایا : ان شاہمیریوں نے میری ٹوپی دفن کرکے اپنی سلطنت کو بھی دفن کر دیا ہے ۔ اب وہ زیادہ دیر تک حکومت نہیں کر سکتے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ ۹۶۲ھ میں ''چک خاندان'' برسر اقتدار آ گیا[9] ۔ یہ تھی اس سالارِ عجم کی معماری تقدیر کی مثال ۔

تیسرے شعر میں امام غزالی (وفات ۵۰۵ھ) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھیں ''اللہ ھو'' (یعنی ''ذکر'') کے ''درس'' کی نعمت شاہ صاحب کے خاندان سے ہی ملی تھی ۔ امام ابو حامد محمد غزالی طوسی عظیم عالم ، فلسفی اور متکلم تھے ۔ البتہ اُن کی زندگی میں عظیم انقلاب آیا اور وہ ''وادی عرفان'' میں گامزن ہوئے ۔ یہ شافعی مسلک کا امامِ زمانہ وادی تصوف کا بھی ناصحِ فرزانہ بن گیا اور فلسفہ و تصوف کو قریب تر لے آیا ۔

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی[10]

امام غزالی اور سادات کی ملاقاتوں کے بارے میں جو کچھ قاضی نوراللہ شوشتری (وفات ۱۰۹۱ھ) نے مجالس المومنین میں لکھا ہے اُس کی محققانہ تردید ہو چکی ہے لیکن علامہ کا اشارہ شاید امام غزالی اور سید مرتضیٰ علوی حسینی ذوالشرفین المعالی محمد (وفات ۴۸۰ھ) کی ملاقات کی طرف ہو ۔ امام کی عمر اس وقت ۳۰ سال سے کچھ کم تھی ۔[11] بہر صورت غزالی نے ''درس اللہ ہو'' لیا ہو یا نہ شاہ صاحب کا خاندان علوم ''باطنی'' کی طرف خاص تمایل رکھتا تھا ۔ اُن کے والد نے سلطان اولجائتو کی منظوری سے شاہ صاحب کے بچپن میں ۴۰۰ اولیاء اللہ اور علماء دین کی جو کانفرنس ''سلطانیہ'' میں بلائی تھی اور اُن بزرگوں کے مختلف مشورے قبول کیے تھے ، یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی ۔

چوتھا شعر شاہ صاحب کی مصلحانہ اور مشیرانہ سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ ''کشور مینو نظیر'' سے مراد بظاہر کشمیر ہے اور شاہ صاحب یہاں کے ''سید'' ہیں : ''سید القوم خادمھم'' ۔ جیسا کہ عرض کیا شاہ صاحب کی مساعی یہاں پر (ہمدان ، ختلان اور ماوراءالنہر کے دوسرے علاقوں وغیرہ کے

۹- Kashir, I, 90 -

۱۰- بانگ درا ، ۲۲۵ -

۱۱- جلال ہمائی ، غزالی نامہ ، ۱۲۵ -

مقابلہ پر) زیادہ مؤثر اور با نتیجہ رہیں ۔

اُن کی زندگی واقعاً درویش اور امراء اور سلاطین سب کی مشیر تھی اور سب اُن کے احترام اور علو مقام کے قائل تھے ۔ ایک طرف ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ مجاہدۂ نفسانی اور سیر و سلوک عارفانہ میں گزارتے ہیں اور بیشتر کتابیں اسی موضوع پر تالیف فرماتے ہیں—اور اُن کے درجنوں معروف مریدوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں مثلاً سید خواجہ اسحاق ختلانی و نورالدین جعفر بدخشی (جس نے اُن کے مناقب میں "خلاصۃ المناقب" لکھی) و میر سید حسین سمنانی وغیرہ ، دوسری طرف ان کی توجہ کا ہدف امراء و سلاطین ہیں کیوں کہ وہ جانتے تھے اس طبقے کی اصلاح بہت ضروری ہے ! الناس علی دین ملوکھم" ۔ اُن کی کتابیں "ذخیرۃ الملوک" ، "مرأت التائبین" ، "عقبات" اور مجموعۂ "مکاتیب" وغیرہ ان تعلقات پر دلیل ہیں ۔[۱۲] اُن کے مراسم بزرگانہ کشمیر ، بلخ ، بدخشاں ، بخارا اور پکھلی وغیرہ کے حکام سے استوار تھے ۔ شاہ صاحب ان امراء و سلاطین کو عدل ، خدا خوف اور بیشتر رفاہ عامہ کے کاموں کی تلقین فرماتے تھے ۔ (اس شعر کے پیش نظر) کشمیر کے بادشاہوں نے جو شاہ صاحب کے مشورے قبول کیے ان کا ایک خاکہ پیش کرتا ہوں :

(۱) سلطان شہاب الدین نے اُن کے مشورے اور تلقین پر ۷۷۴ھ میں "وی ہند" کے بادشاہ کے ساتھ اٹک کے قریب اپنی جنگ بند کی تھی ۔ (۲) سلطان قطب الدین نے خلاف شرع اسلامی دو سگی بہنوں سے شادی کر رکھی تھی اور شاہ صاحب کے فرمان پر ایک کو فوراً طلاق دے دی ۔ (۳) مدرسوں ، شفا خانوں ، خانقاہوں اور مساجد کا قیام اور صنعت شالباف کی دوبارہ سرپرستی ان دونوں بادشاہوں نے شاہ صاحب کے صائب مشوروں سے ہی انجام دی ۔[۱۳]

پانچواں شعر بہت ہی بلیغ ہے اور "دریا آستین" کی ترکیب کا تو جواب نہیں ۔ کیا لفظی کیا معنوی اعتبار سے ۔ اس شعر کا دوسرا مصرع "مسلمان کشمیر" کی تاریخ کا واضح عنوان ہے اور شاہ صاحب کی پانچ سالہ سرگرمیوں[۱۴] کا خلاصہ بھی

۱۲۔ یہ کتابیں تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتاب خانہ میں موجود ہیں (نمبر ۶۶۸ - ۶۷۲ عکسی نسخے) اور تمام بادشاہوں اور امراء کی درخواست پر لکھی گئی ہیں ۔

۱۳۔ Kashir, II, 372, 563, 604 ۔

۱۴۔ شاہ صاحب ۷۷۴ھ میں چار ماہ ، ۷۸۱ھ سے ۷۸۳ھ تک ڈھائی سال اور پھر ۷۸۵ھ سے ۷۸۶ھ کے اواخر تک تقریباً ۲ سال کشمیر میں رہے اور مجموعی طور پر یہ مدت ۵ سال بنتی ہے ۔

ہے ۔ شاعر نے فرمایا کہ شاہ صاحب نے خطہ کشمیر کو ''علم ، صنعت ، تہذیب ، اور دین'' دیا ہے اور اس اجمال کو کسی قدر تفصیل میں بیان کرنا ضروری ہے ۔

دین اسلام کشمیر میں بڑی دیر سے پہنچا ۔ اکا دکا مثالوں کو چھوڑ کر ، یہ دین آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں یہاں پہنچا ۔ یہاں کے سب سے پہلے مبلغ نامدار سید عبدالرحمان بلبل شاہ (وفات ۷۲۷ھ) تھے جن کے ہاتھ پر بدھ راجہ رینچن (جو مسلمان ہو کر سلطان صدرالدین کہلایا ۔ ۷۲۰ - ۷۲۳ھ) مسلمان ہوا اور ساتھ ساتھ دس ہزار اور رعایا ۔ اس کے بعد تقریباً ۱۸ سال کشمیر خانہ جنگی اور مذہبی تفرقہ کا گھوارہ بنا رہا اور ۷۴۰ھ میں شاہ میر یا شاہ مرزا (بعد میں سلطان شمس الدین ۷۴۰ - ۷۴۳ھ) نے دوبارہ اسلامی سلطنت کو بحال کیا ۔ اسی دوران ۷۴۰ یا ۷۴۱ھ میں شاہ صاحب نے اس آشفتہ حالت میں کشمیر کو اپنے سفر کے دوران دیکھا تھا اور شاید اسی آشفتگی کی بنا پر ''شاہ دریا آستین'' نے اس کو ''ایران صغیر'' بنانے کا عزم کر لیا تھا اور ایسا کرکے رہے ۔

غرض شاہ صاحب کی آمد کے زمانے میں ''مسلمان کشمیر'' متزلزل اور نو آئین تھا ۔ سلطان شہاب الدین نے یہاں پہلا مدرسہ بنوایا جس میں علوم اسلامی کی تدریس شروع ہوئی اور اس مدرسہ میں جنم لینے والی ایک شخصیت امام القراء ابو المشائخ شیخ عثمان تھی ۔ فارسی زبان و ادب کا رواج شاہ صاحب کے دم سے تیز تر ہوتا گیا ۔ وہ اپنی کتابیں ساتھ لے آئے تھے اور سلطان قطب الدین کے زمانے میں ایک کتب خانہ بھی قائم کر لیا تھا ۔ وہ علاءالدین پورہ میں صبح کی نماز کے بعد درس و وعظ ارشاد فرماتے تھے ۔ کئی ہندو ساحر اور جادوگر اُن سے مناظرہ و مجادلہ کرکے اور کرامات دیکھ کر مسلمان ہو گئے ۔ اُن کے جائے وعظ پر اُن کے فرزند میر سید محمد ہمدانی (۷۷۴ - ۸۵۴ھ) نے ''خانقاہ معلیٰ'' بنائی تھی جسے ''مسجد شاہ ہمدان'' کے نام سے بھی شہرت حاصل ہے اور سری نگر میں قائم ہے ۔ شاہ صاحب (دیگر بزرگوں کی مانند) اکل حلال کی خاطر کلاہ باقی کرتے تھے ۔ ہمدان اور ایران کی کئی صنعتوں کو یہاں رواج دیا ۔ شالباقی کی قدیم صنعت یہاں عالم نزع میں تھی ۔ شاہ صاحب کی تشویق اور سلطان قطب الدین کی سرپرستی سے اس کا احیاء ہوا ۔ کشمیر میں ہندو تہذیب کی جگہ اسلامی اور ایرانی تہذیب ، سنسکریت کی جگہ فارسی اور عربی زبانیں رواج پانے لگی تھیں[15] ۔

۱۵- Kashir, II, 88-89 ؛ پاکستان میں فارسی ادب ۲۹۵ ، ۳۰۱ - ۳۰۲ ؛ تاریخ حسن ۲ ، ۱۹۷ ۔

چھٹا شعر ، پانچویں شعر سے معنوی طور پر مربوط ہے ۔ شاہ صاحب نے ان عجیب و دل پذیر ہنر و صنعتوں سے خطہ کو ''ایران صغیر'' بنا دیا ۔

یہ صحیح ہے کہ جب ایران کی تہذیب ، زبان اور صنعتیں شاہ صاحب اور دوسرے سادات ایرانی کے ذریعے یہاں پھیل گئیں تو ''کشمیر'' میں ''ایران'' کی تمام خصوصیتیں جمع ہو گئیں ۔ دین اسلام بھی کافی رواج پا چکا تھا ۔ قدرت کے ہاتھوں نے بھی ''ایران کبیر و صغیر'' میں کافی مماثلت رکھی ہے ، کشمیر کا طبعی حسن ، ایران کے شمال مغربی علاقوں اور کوہستانی خطوں کے حسن سے بہت مشابہ ہے (اور شاہ صاحب کا کوہستانی مولد ہمدان بھی حسن میں کم نہیں) ۔ بحر خضر کے سواحلی علاقے حاصل اور آب و ہوا کے اعتبار سے کشمیر سے کافی مماثلت رکھتے ہیں ۔ انسانی حسن کا بھی یہی حال ہے ۔ شاہ صاحب کے معاصر بزرگ خواجہ حافظ شیرازی (وفات ۷۹۲ھ) ''ترکان سمرقندی'' اور ''سیہ چشمان کشمیری'' دونوں پر برابر کی نگاہ امید رکھتے ہیں ۔

بشعر حافظ شیراز می رقصند و می نازند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

(یاد رہے کہ اُس وقت سمرقند ، ایران کا ایک شہر تھا) ۔ اور زبان و ادب فارسی کا بھی یہی عالم ہے مثلاً برصغیر ہند و پاک کے ہر مرکزی شہر کے مجموعی شعراء سے اُن شعرا کی تعداد زیادہ ہے جو کشمیر میں پیدا ہوئے ۔[16]

آخری تعارفی شعر میں شاہ صاحب کی ''قوت نگاہ'' کا ذکر کیا گیا ہے :

یک نگاہ او گشاید صد گرہ

قارئین اقبال جانتے ہیں کہ اُن کے نظام افکار میں ''نگاہ'' کی کیا اہمیت ہے ۔ علامہ کے بیسیوں بہترین اشعار نگاہ کی اہمیت کے بارے میں ہیں ۔ مثلاً :

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و ''نگاہ'' مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

''نگہ'' بلند ، سخن دلنواز ، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

ای پسر ''ذوق نگہ'' از من بگیر
سوختن در لا الہ از من بگیر

۱۶- مجلہ ''ہلال'' (فارسی) نومبر ۱۹۵۵ ۔

اور یہ ''نگاہ'' کے کرشمے اُن کو شاہ صاحب کی ''جلالی'' اور ''روحانی'' شخصیت میں نظر آئے ۔ اُن کی ''نگاہ'' جس پر بھی ''جمال'' سے پڑی کندن بن گیا ۔ ''جلال'' اور قہر سے پڑی تو خاکستر ہو گیا ۔ اس ضمن میں ایک دو دلچسپ واقعات درج کرتا ہوں ۔

(۱) صاحب ''خلاصۃ المناقب'' نے لکھا ہے کہ مسافرت کے دوران شاہ صاحب ایک ایسے مقام پر پہنچے (شاید جزائر مالدیو میں) جہاں کے لوگ ایک مقفل دروازے کے بارے میں معتقد تھے کہ جو یہاں رات کو داخل ہو ، محرمانہ طور پر مر جاتا ہے اور صبح کو اس کی لاش ہی ملتی ہے ۔ شاہ صاحب اصرار کر کے وہاں داخل ہوئے ۔ آدھی رات کے وقت دو ساحرہ عورتیں شمع بدست وہاں جا نکلیں (تاکہ اُن کا کام تمام کریں اور لوگوں کے اعتقاد کو برقرار رکھ کر اپنی دکان سجائے رکھیں) ۔ شاہ صاحب نے ایک نگاہ خاص ڈالی اور ساحرہ خاکستر ہو گئیں ۔

(۲) کشمیر کی مشہور عارفہ شاعرہ اور صوفیہ لل ددی ، بابا طاہر کی مانند ''عریاں'' رہا کرتی تھی اور کہتی تھی— کوئی مرد نظر آئے تو پردہ کروں ۔ اتفاق سے ایک دن شاہ صاحب کی ''نگاہ'' اس پر پڑی—ہوش میں آ گئی، دوڑی ہوئی ایسے جا رہی تھی جیسے ارشمیدس اصول حجم جاننے پر—'' آج ایک مرد دیکھ لیا ۔ اب میں عریاں نہیں رہوں گی ۔'' غرض شاہ صاحب کے ہاتھ پر اسلام لے آئی اور ایک با شرح خاتون کی مانند مرید بن گئی[۱۷] :

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس خراج عقیدت کے بعد علامہ نے شاہ صاحب سے جو گفتگو کی ہے اور ان کے چند نظریات اور افکار کو پیش کیا ہے ، اس پر مختصر بحث کرنا ہے ۔

علامہ پہلا سوال خیر و شر کی آویزش ابدی کے بارے میں پوچھتے ہیں ۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایک طرف تو شیطان (شر کا مظہر) پیدا کر رکھا ہے جس کی قوتیں ہر آن برائی کی طرف راغب اور نیکی سے منحرف کرنے والی ہیں اور دوسری طرف اطاعت فرائض اور نیک عملی کی اتنی تاکید ہے اور جزا و سزا کا یہ خوف ؟

شاہ ہمدان جواب میں فرماتے ہیں کہ اس میں یہ مصلحت ہے کہ اس قوی دشمن سے نبرد آزمائی کر کے ہم اپنی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتے رہیں اور کسی وقت بھی غفلت اور تساہل کو قریب نہ آنے دیں ۔ قوی دشمن سے مقابلہ مقاومت کرنے میں انسانی شخصیت کی ایسی ہی جلا ہوتی ہے جیسے سان

۱۷- Kashir, II, 583 -

پر لگانے سے تلوار کی دھار بنتی ہے اور اس کے جوہر نمایاں اور کاری ضرب لگانے لگتے ہیں ۔ شیطان کی مصاحبت انسانی تباہی ہے اور اس سے جنگ ، انسانیت کا کمال ہے ۔

قارئین جانتے ہیں شیطان یا ابلیس کا اقبال نے کم و بیش اپنی تمام تصانیف میں ذکر کیا ہے ۔ مگر جاوید نامہ ، بال جبریل اور ارمغان حجاز میں زیادہ مفصل اور واضح ہے ۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مثلاً مجلہ اقبال (انگریزی) میں مرحوم تاج محمد خیال کا مقالہ ۔ علامہ کو یہ موضوع بہت پسند تھا اور بظاہر اس پسند کی وجہ ان کا فلسفہ خودی ہے ۔

ہر کہ دانای رموز زندگی است فضل حق داند اگر دشمن قوی است[۱۸]

ظاہر ہے کہ شیطانی قوتیں جہاد بالنفس کے وسائل فراہم کرتی ہیں اور علامہ کی نظر میں یہ خودی کی نشو و نما کا بہت بڑا وسیلہ ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ سوال آخر شاہ صاحب سے کیوں پوچھا ؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی شیطان اور اس کی قوتوں سے نبرد آزمائی کی امثلہ سے حیرت انگیز طور پر مملو ہے اور دور آخر کے بزرگان دین میں شاید وہ ''جہاد بالنفس'' اور ''جہاد باللسان'' کا بہترین نمونہ ہیں ۔ ان کی بیشتر تصانیف بھی اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں ۔ ان کی کتابیں ''مرأت التائبین'' اور ''اوراد فتحیہ''[۱۹] نیز ان کے بارے میں جعفر بدخشی کے ''خلاصۃ المناقب'' کا مطالعہ اس عقدہ کی گرہ کشائی کر دیتا ہے ۔ ان کی ۷۳ سالہ زندگی میں سے ۶۱ سال کا ملاً مجاہدات اور جہاد نفس میں گذرے اسی لیے ایک جگہ فرماتے ہیں :

''جو کچھ میرے دادا علی زین العابدین کو دیا گیا ہے مجھے بھی دیا گیا ہے اور میرے دادا کا بہترین مقام ان کا لقب (زین العابدین) ہے[۲۰]۔''

ان کے مجاہدات نفس کے واقعات سے ہٹ کر ان کی حق گوئی بھی شیطانوں سے نبرد آزمائی کی مثالیں فراہم کرتی ہے ۔ امیر تیمور سے ''حکمت'' کے موضوع پر بحث تلخ ان کی مہاجرت کا سبب بنی ۔ ایک مرتبہ نام نہاد علمائے دین کی ایسی خبر لی کہ انھوں نے کھانے میں زہر ملا کر شاہ صاحب کو ہلاک کرنے کی

۱۸- اسرار و رموز ۳۸ ۔

۱۹- نمبر ۴۲۵ کتاب خانہ ملک (تہران) ۔ یہ کتاب تہران میں چھپ بھی چکی ہے ۔

۲۰- خلاصۃ المناقب برگ ۲۳ ب (نسخہ کتب خانہ بادلین جو کہ مرکزی کتب خانہ تہران یونیورسٹی میں موجود ہے) ۔

کوشش کی ۔ فضل خداوندی سے بچ تو گئے مگر زہر کا اثر ساری عمر باقی رہا[۲۱] ۔ اس قسم کے عواقب سے ان کو کئی بار دو چار ہونا پڑا ۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں میں مشکلات کا ایک خاکہ ان کے ''مکتوبات'' میں ملتا ہے ۔ ایک مرتبہ اس شیطان شکن شخصیت پر جب نفس پرستوں نے حملہ کیا ، تو اس نے جواب دیا : خدا کی قسم اگر زمین و آسمان آگ اگلنے لگیں تو بھی میں صرف ''حق بات'' ہی کہوں گا[۲۲] ۔ شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو کئی مقام پر نصیحت کی ہے کہ اس حدیث رسولؐ پر عمل کریں ''بہترین جہاد سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا'' ہے اور رسالہ ''فتوتیہ''[۲۳] میں حقیقی جواں مرد کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ شیطانی قویٰ کا سر کچل ڈالے ۔ پس ثابت ہوا کہ شیطان مآبوں سے ٹکر لینا شاہ صاحب اور علامہ کا مشترک موضوع تھا ۔

اس سوال کا جواب سن کر علامہ مرحوم شاہ صاحب کو اپنے آبائی وطن اور شاہ صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کی جولان گاہ ، کشمیر کی دل دوز داستان سناتے ہیں ۔ پہلے کشمیریوں کی بےعملی ، غلامی پسندی اور خود فراموشی کا رونا روتے ہیں :

از خودی تابی نصیب افتادہ است — در دیار خود غریب افتادہ است
از غلامی جذبہ ہای او بمرد — آتشی اندر رگ تاکش فسرد

یہ وہ قوم ہے جو :

در زمانی صف شکن ہم بودہ است — چیرہ و جانباز و پر دم بودہ است

پھر علامہ انگریزوں کی اس ناپاک سازش کا ذکر فرماتے ہیں جس کے نتیجے میں سرزمین کشمیر ۷۵ ہزار سکہ نانک شاہی کے عوض گلاب سنگھ نے خرید لی تھی (اس فجیع واقعہ کو بیع نامہ امرتسر ۱۸۴۶ کہتے ہیں) :

دہقان و کشت و جوی و خیابان فروختند
قومی فروختند و چہ ارزان فروختند

اس سلسلے میں علامہ نے سلطان شہاب الدین (۵۵ - ۷۷۵ھ) کی تعریف فرمائی ہے ۔ یہ وہی مقتدر بادشاہ ہے جس نے کشمیر کے نواحی علاقے فتح کر لیے تھے اور کشمیر میں اولین اسلامی نقوش اور کئی رفاہ عامہ کے کام اس کی سلطنت کی

۲۱- خلاصۃالمناقب برگ ۹۶ ب ۔
۲۲- مجموعۂ مکاتیب (جن کا ذکر گذر چکا ہے) ۔
۲۳- رسالہ ''فتوتیہ'' بھی ۶۶۸ - ۶۷۲ مجموعہ میں موجود ہے راقم الحروف اس پر مقدمہ لکھ کر چھپنے کی غرض سے تیار کر رہا ہے ۔

یادگار ہیں ۔

شاہ صاحب کشمیر کی حالت زار سن کر ''خلوتیوں'' کی ''ایمائی زبان'' میں کشمیریوں کو پیغام دیتے ہیں کہ انسانی ''وجود'' روح و بدن سے تشکیل پاتا ہے مگر روح کی بالیدگی اور ''جلوہ مستی'' کی خاطر ، بدن کو مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور اگر ''روح'' بیدار ہو جائے تو امتوں کی تقدیر بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی :

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی[۲۳]

کشمیر کی یہ وہ حالت تھی جو جاوید نامہ کے لکھنے وقت (۱۹۲۸ - ۱۹۳۲) علامہ مشاہدہ کر رہے تھے ۔ یہ حالت بجائے سنبھلنے کے بگڑتی ہی رہی یہاں تک کہ ''نوبت باینجا رسید'' مگر کشمیری بیدار سے بیدار تر ہوتے رہے ۔ انھوں نے نہ کسی قربانی سے دریغ کیا ہے اور نہ اب کریں گے :

تا ز جان بگذشت جانش جان اوست
ورنہ جانش یکدو دم مہمان اوست

دوسرا سوال علامہ نے خراج اور مالیات کی ادائیگی کے جواز کے بارے میں پوچھا ہے :

ما فقیر و حکمران خواہد خراج
چیست اصل اعتبار تخت و تاج

شاہ صاحب نے (یعنی اُن کی زبانی اقبال نے) اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ مسلمانوں کو (برصغیر اور کشمیر دونوں میں) دعوت ''جہاد اور آزادی'' تھا ۔ البتہ جواب اس نوعیت سے ادا کیا ہے کہ ''کمال گویائی'' کا مصداق ہے ۔ اقبال کی اسی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے کہا تھا کہ اگر مسلمان اقبال کو سمجھ لیتا تو ایک دن بھی غلام نہ رہتا اور اگر انگریز سمجھ لیتا تو اقبال کی ساری زندگی قید و بند میں گزرتی — اور یہ جواب بھی اسی ضمن میں آتا ہے ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بادشاہی یا تو رضائے عوام سے لی جاتی ہے یا جنگ و فساد سے ۔ جو بھی صورت ہو ''باج'' یا ٹیکس لینے کے دو شخص مجاز ہیں : اول ایسا مسلمان اور با عمل حاکم جو از روئے قرآن مجید ''اولوالامر'' بننے کا مستحق و مجاز ہے (یعنی جو خدا اور رسول[ؐ] کے فرامین پر عمل پیرا ہے) یا وہ جنگ جو فاتح اور جوانمرد جو جنگ میں قہر کا اور صلح میں دلبری کا مظہر

۲۳- بانگ درا ، ۲۹۲ ۔

ہو ۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات بھی اساساً مسلمان کی ہیں مگر دوسرے فاتحین نے بھی اسے اپنایا ہے ۔ مثلاً بقول شیخ سعدی اسکندر اعظم یونانی کی کامیابی کا یہی راز تھا کہ مفتوحین سے نرم سلوک کرتا تھا[۲۵] اور اگر یہ صفات غیر مسلم فاتح کی بھی ہوں تو بھی برصغیر اور کشمیر کے نافرجام حکام اس پر پورے نہیں اترتے تھے ۔ ان کی کامیابی ریشہ دوانیوں اور ظلم و تعدی کے بل بوتے پر تھی ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کشمیر تو کیا ، ایران اور ہندوستان جیسے بڑے ملک بھی خرید لیے جا سکتے ہیں مگر ''بادشاہی خریدی نہیں جا سکتی''۔ جو بادشاہی اور حکومت عدل و انصاف اور ''قاہری و دلبری'' سے متصف نہ ہو وہ پائدار نہیں رہ سکتی اور نہ رہے گی ۔

اگر اس جواب کو واقعی ''جہاد کا پیغام'' سمجھا جائے تو یہ نکتہ بھی جاننا چاہیے کہ شاہ ہمدان مخصوص ماحول کی وجہ سے کفار کے بارے میں بہت سخت تھے ۔ اپنے عربی رسالہ ''الناسخ و المنسوخ فی القرآن مجید''[۲۶] میں انہوں نے صلح و رواداری کے مضامین والی کئی آیات کو منسوخ لکھا ہے اور اُن کا ناسخ اُن آیات کو لکھا ہے جو جہاد اور قتال کے پیام کی حامل ہیں ۔ یہ عجیب توارد کار ہے کہ کشمیری ایک عرصے سے جہاد و قتال پر عمل پیرا ہونے کے لیے مجبور کیے جا رہے ہیں اور اب بھی (شاہ صاحب اور علامہ مرحوم کی توقعات کے مطابق) :

دل میان سینہ ی شان مردہ نیست
اخگر شان زیر یخ انسردہ نیست

۲۵- گلستان سعدی (مقدمہ ڈاکٹر جواد مشکور) ۵۶ ۔

۲۶- نسخہ خطی نمبر ۲۸۳ (کتب خانۂ مرکزی دانش گاہ تہران) میں لکھتے ہیں :

''یسئلونک عن الشهر الحرام قتال فيه'' منسوخ بہ ''اقتلو المشرکین حيث و جدتموهم'' . . . . ''لا اکراه فی الدين'' منسوخ بہ : ''جاهدالکفار والمنافقين'' وغیرہ ۔

بظاہر شاہ صاحب کے مخصوص عصر نے اُن کو ایسا ''شدید اللحن'' بنا رکھا تھا ورنہ بقول مولانا روم :

امر حق را ہم با مر حق شکن
بر زجاج دوست سنگ دوست زن

ناصر خسرو

خواجہ عبدالحمید یزدانی*

حکیم الامت نے جاوید نامہ میں ایک جگہ ایران کے مشہور شاعر ناصر خسرو کے ایک قصیدے سے ذیل کے پانچ اشعار[1] اس ذیلی عنوان کے ساتھ درج کیے ہیں :
نمود ار می شود روح ناصر خسرو علوی و غزلے مستانہ سرائیدہ غایب میشود ۔

دست را چون مرکب تیغ و قلم کردی ، مدار
ہیچ غم ، گر مرکب تن لنگ باشد یا عرن
از سر شمشیر و از نوک قلم زاید ہنر
ای برادر ہمچو نور از نار و نار از نارون
بی ہنردان نزد بی دین ہم قلم ہم تیغ را
چون نباشد دین ، نباشد کلک و آہن را ثمن
دین گرامی شد بدانا و بنادان خوار گشت
پیش نادان دین چو پیش گاو باشد یاسمن
ہمچو کرباسی کہ از یک نیمہ زو الیاس را
کرتہ آید وز دگر نیمہ یہودی را کفن

جو جذبہ ان پانچ اشعار میں کار فرما نظر آتا ہے وہ ناصر خسرو کے تقریباً

*خواجہ عبدالحمید یزدانی لیکچرار گورنمنٹ کالج بہاول پور ۔

۱۔ ناصر خسرو کا یہ قصیدہ چھیالیس اشعار پر مشتمل اور اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

ای دیدہ ہمچو خون کردہ رخان از خون دل
خون دن خونت بخواہد خورد ، گرد دن مدن

مذکورہ بالا پانچ اشعار اس قصیدے کے مختلف مقامات سے لیے گئے ہیں ۔ دیوان اشعار حکیم ناصر بن خسرو قبادیانی مرتبہ حاجی نصراللہ تقوی مطبوعہ ایران ، صفحہ ۳۲۹ - ۳۳۱ -

تمام قصائد میں پورے طور پر جاری و ساری ہے ۔ اس کے ان جذبات و خیالات سے بحث کرنے سے بیشتر مناسب ہوگا اگر اس کی زندگی کے مختصر حالات[۲] بیان کر دیے جائیں تاکہ اس پس منظر کے ساتھ اسے سمجھنے میں آسانی رہے ۔

ناصر بن خسرو بن حارث نام ، ابو معین کنیت اور لقب و تخلص ''حجت''[۳] حجت کا لقب جو اسماعیلیہ[۴] فرقے کا ایک مذہبی درجہ ہے ، اسے فاطمی خلیفہ نے دیا تھا ۔ قبادیان (بلخ) سے تعلق تھا ، بعد میں بلخ اور مرو میں رہنے کے سبب بلخی

۲- ان حالات کے لیے دیباچہ دیوان ناصر خسرو از تقی‌زادہ ، صفا : تاریخ ادبیات در ایران دوم ، شفق : تاریخ ادبیات ایران ، براؤن : تاریخ ادبیات ایران ، دوم ، فارسی ترجمہ اور تعلیقات و حواشی ؛ اردو ترجمہ دربار ملی از راقم حروف (مجلس ترقی ادب لاہور) صفحہ ۲۷۷ سے استفادہ کیا گیا ہے ۔

۳- **حجت :** خلفائے فاطمی کے ''باطنیہ اسماعیلیہ'' پیروکار انھیں (خلفا) امام زمان جانتے تھے ۔ اس کے علاوہ امام کے بارہ ''نقیبوں'' یا ''بابوں'' کے بھی قائل تھے جن میں سے ہر ایک دنیا کے کسی ایک حصے میں اسماعیلی فرقے کے تبلیغ و اشاعت پر مامور ہوتا ۔ ایسا علاقہ ''منطقہ'' اور اس علاقے کا نقیب یا باب ''حجت'' کے نام سے موسوم ہوتا ، اور وہ امام اور اس علاقے کے لوگوں بالخصوص اپنے فرقے کے لوگوں کے درمیان ایک وسیلہ ہوتا تھا ۔ (دیباچہ دیوان ناصر خسرو ، حاشیہ صفحہ ح)

۴- **اسماعیلیہ :** شیعہ فرقے کی ایک شاخ ہے ۔ یہ فرقہ اسماعیل بن جعفر صادق اور ان کے بھائی موسی بن جعفر کی امامت پر اختلاف کے سبب معرض وجود میں آیا ۔ امام جعفر نے پہلے اسماعیل کو جانشین بنایا تھا لیکن پھر کسی بنا پر موسیٰ کو نامزد کیا ۔ اسماعیل باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے ۔ ان کے طرف داروں کا کہنا تھا کہ امام جعفر کی رحلت کے بعد امامت خاندان اسماعیل ہی میں رہنا چاہیے اور چونکہ اسماعیل اپنے والد کی وفات سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے اس لیے امامت محمد بن اسماعیل کو منتقل ہوئی جو ''سابع تام'' ہیں اور ساتواں دور ان پر ختم ہو جاتا ہے اور ان کے بعد ان کے خاندان میں باقی رہے گی تو یہ طرفداران اسماعیل ، اسماعیلیہ یا ''باطنیہ سبعیہ'' کہلائے ــــــ ــــــ محمد کے بعد کے امام دو دستوں میں بٹ گئے ۔ ایک دستہ کے امام ''ائمہ مستور'' کہلائے جو شہروں میں خفیہ طور پر گھومتے جبکہ ان کے داعی آشکارا تبلیغ میں مصروف رہے ۔ ان ائمہ کے بعد عبیداللہ مہدی کا دور آیا جنھوں نے کھلم کھلا تبلیغ کی اور ان کے بعد ان کی اولاد امام ہے ۔

اسماعیلی اپنی تبلیغ میں خاص مراحل کو پیش نظر رکھتے تھے ۔ ان کے داعی حسب مراتب متعین ہوتے ۔ آخری مرتبہ ، مرتبہ حجت تھا جس پر صرف چند ایک داعی ہی پہنچتے تھے ۔ ایرانیوں میں یہ رتبہ صرف ناصر بن خسرو اور

اور مروی بھی کہلایا ۔ حکیم الامت کی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اسے علوی لکھا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی صحیح ماخذ دستیاب نہیں ہے ۔ یہ جو بعض جگہ اس کا نسب پانچ واسطوں سے امام علی بن موسیٰ الرضا سے ملایا جاتا ہے تو یہ غلط ہے ۔ البتہ اسے طبرستان کے سادات حکمرانوں میں سے ایک ناصر علوی (چوتھی صدی ہجری) یا سید محمد ناصر علوی اور اس کے بھائی سید حسن ناصر علوی سے کہ دونوں شاعر تھے اور ان کا ذکر لباب الالباب میں ہے ، خلط ملط کر دیا گیا ہے ۔ ورنہ یہ بات قطعی ہے کہ ناصر خسرو سادات میں سے نہ تھا ۔

ناصر ذیقعد ۳۹۴ھ[۵] میں قبادیان میں پیدا ہوا ، اور ۴۸۱ھ میں بمقام یمگان (بدخشاں) وفات پائی ۔ اس کا تعلق اسماعیلی فرقے اور بڑے ثروت مند خاندان سے تھا ۔ بچپن ہی سے علم و ادب میں مشغول ہوا ۔ جوانی میں سلاطین و امرا کے درباروں میں رسائی پا کر مراتب عالی سے سرفراز ہوا ۔ محمود غزنوی اور اس کے بیٹے مسعود کے درباروں میں رہا ۔ اس لحاظ سے ۲۶ برس کی عمر میں اس کا تعلق دربار سے ہو گیا ۔ ۴۳ سال کی عمر تک جبکہ وہ سفر کعبہ پر روانہ ہوتا ہے ،

حسن بن صباح کو ملا ۔ یہ لوگ اپنی تبلیغ کے بلند مرحلوں میں فلسفہ اور دین کو ایک دوسرے کا لازمہ جانتے تھے ۔ یہاں تک کہ فلاسفۂ بزرگ کو انبیاء کے ہم پایہ قرار دیتے تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ پیغمبر ''سیاست عامہ'' کی تنظیم و تنسیق کرتے ہیں اور فلسفی ''حکمت خاصہ'' کی ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی تبلیغ میں اپنے پیروکاروں کے اذہان کو آغاز کار ہی سے یونانی فلسفہ کے اجرا سے آشنا کرتے ۔ ان کا اعتقاد تھا کہ دین کے ظواہر کے کچھ باطن ہیں جن سے فقط امام آگاہ ہے ۔ ان ''باطنوں'' کو یا تو امام سے یا پھر کسی ایسے شخص سے سیکھنا چاہیے جس نے ان کی تعلیم امام سے پائی ہو ، اور یہی امر اس کا سبب بنا کہ یہ لوگ دین کی ظاہری باتوں سے ہٹ کر اس کی حقیقت اور نچوڑ کی طرف متوجہ ہوئے ۔ چونکہ یہ ان ''باطنوں'' کو عقلی و فلسفیانہ تاویلوں سے ظاہر کرتے تھے اس لیے قدرتی طور پر انھیں تفکر و استدلال کی عادت پڑ جاتی تھی ، اور پھر چونکہ اپنی تبلیغ و دعوت میں فلسفہ یونان کے اصولوں سے استفادہ کو جائز سمجھتے تھے ، اس لیے طبعی طور پر فلسفیانہ علوم کی تحصیل میں رغبت رکھتے اور حکما و علماء کے حامی ہوتے تھے ۔ نظام الملک طوسی نے اپنی کتاب سیاست نامہ میں اس فرقے کی کچھ تاریخ بیان کی ہے ۔ صفا : تاریخ ادبیات اول ، ۲۳۵ - ۲۳۹ ، براؤن تاریخ ادبیات ایران فارسی ترجمہ ۵۶۹ ، ۵۷۰ ۔

۵- بگذشت ز ہجرت پس سیصد نود و چار
بنہاد مرا مادر بر مرکز اغبر

(دیوان صفحہ ۱۷۳)

سکریٹری جیسے بلند عہدے پر پہنچ چکا تھا ۔ اپنے ہم عصروں میں وہ ''ادیب'' اور ''دبیر فاضل'' کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا ۔ بادشاہ نے اسے ''خواجۂ خطیر'' کا خطاب دے رکھا تھا ۔ گویا شروع ہی سے اسے دربار بلخ میں جو غزنویوں کا موسم سرما کا پایہ تخت تھا ، خاصا اقتدار و نفوذ حاصل ہو چکا تھا ۔ جب سلجوقیوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اس کے اعتبار و نفوذ میں اور بھی اضافہ ہوا ۔

۴۳۲ھ میں ناصر مرو چلا گیا اور وہاں سلجوق حکمران ابو سلیمان چغری بیگ کے دربار میں خدمت دیوانی پر مامور ہوا ۔ اس نے ایک عرصہ کسب مال و جاہ اور لہو و لعب میں بسر کیا ۔ اس دوران میں آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی اور معرفت حقائق کی جستجو میں وہ علماء عصر سے بحث و مذاکرہ کرتا رہا ۔ لیکن اس کی طبیعت تقلید پر مائل نہ ہوئی ۔ اسے اپنے سوالات کے تسلی بخش جواب نہ ملتے جس کے سبب وہ مضطرب سا رہتا ۔ غالباً اسی جستجو کے سلسلے میں اس نے ایک مدت تک ترکستان ، لاہور ، ملتان اور سندھ و ہند وغیرہ کا سفر اختیار اور مختلف مذاہب کے راہنماؤں سے بحث و مذاکرہ کیا ۔ غرض اسی طرح وہ کئی ایک شہروں میں گھوما ۔ آخر ایک خواب[6]

۶۔ اس خواب کا ذکر اس نے سفرنامہ میں اس طرح کیا ہے . . . جوزجان پہنچ کر میں نے ایک ماہ قیام کیا ۔ اس دوران میں مسلسل شراب پیتا رہا ۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تم کب تک یہ شراب پیتے رہو گے جو انسان کی عقل کو زائل کر دیتی ہے ، اگر تم ہوش میں رہو تو بہتر ہوگا ۔ میں نے جواب میں کہا کہ حکما اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بتا سکے جو دنیا کے غموں کا مداوا کر سکے ۔ اس نے کہا کہ بےخودی اور بےہوشی میں کوئی راحت نہیں ہوتی ۔ ایسے شخص کو ''حکیم'' نہیں کہا جا سکتا جو لوگوں کو بےہوشی و مستی کی طرف لے جائے ۔ انسان کو تو ایسی چیز کا طلب‌گار ہونا چاہیے جس سے اس کی عقل و خرد میں اضافہ ہو ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں ایسی چیز کہاں سے حاصل کروں ۔ اس نے جواب دیا کہ جوینده یا بنده ۔ پھر قبلہ کی طرف اشارہ کیا اور غائب ہو گیا ۔ جب میں نیند سے بیدار ہوا تو یہ تمام خواب مجھے یاد تھا ، اس کا مجھ پر بے حد اثر ہوا ۔ میں نے دل میں کہا کہ کل کی نیند سے تو بیدار ہو گیا ہوں اب مجھے چالیس سالہ نیند سے بھی بیدار ہو جانا چاہیے ، اور یہ سوچا کہ جب تک اپنے تمام افعال و اعمال نہ بدلوں گا مجھے خوشی و مسرت حاصل نہ ہوگی ۔ چنانچہ جمعرات ششم جمادی الآخر ۴۳۷ھ . . . کو غسل وغیرہ کر کے جامع مسجد گیا ، نماز ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے برے کاموں سے بچنے اور جو فرض مجھ پر واجب ہیں ان کے ادا

سے متاثر ہو کر جمعرات ۶ جمادی الآخر ۴۳۷ھ/۱۰۴۵ء کو سفر حجاز پر روانہ ہوا ۔ یہ اس کا دوسرا سفر حجاز تھا ۔ ۴۴۴ھ میں واپس بلخ پہنچا ۔ اس سات سال کے عرصے میں اس نے چار[۷] مرتبہ حج کیا اور ایشائے کوچک ، حلب ، طرابلس ، شام ، فلسطین ، سوڈان ، جزیرۃ العرب ، ارمنستان اور کئی دوسرے ممالک کی سیاحت کی ۔ ۴۳۹ھ میں مصر پہنچا ۔ یہاں تقریباً تین سال رہا ۔ یہاں کچھ عرصہ اس نے علم حساب و جبر مقابلہ اور ہندسہ کا درس دیا ۔ عیذاب (سوڈان) میں چند ماہ خطیب شہر رہا ۔ اس قیام کے دوران میں اس میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ۔ یہیں ایک فاطمی داعی کی وساطت سے باطنیہ اسماعیلیہ میں داخل ہوا ۔ پھر فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ ابو تمیم معد بن علی کی خدمت میں پہنچا اور مختلف مراحل و مدارج طے کر کے ''حجت'' کا مرتبہ حاصل کیا ۔ اسی خلیفہ کی طرف سے ''جزیرہ'' خراسان کے مقام حجت اور اسماعیلی فرقہ کی تبلیغ و اشاعت پر مامور ہوا ۔ چناں چہ ۴۴۴ھ میں بلخ پہنچ کر اس نے اس فرقے کی دعوت و تبلیغ شروع کر دی ، اپنے اعیان مختلف اطراف و جوانب میں بھیجے اور اہل سنت علما کے ساتھ مناظرے وغیرہ کیے ، جس کے سبب اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے ۔ اسے ملحد و قرمطی قرار دے کر اس کے قتل کے فتوے بھی صادر کیے گئے ۔ چوں کہ خود سلجوق حکمران اس فرقے کے مخالف تھے اس لیے اسے مجبوراً ترک وطن کرنا پڑا ۔

بلخ سے نکل کر وہ نیشاپور پہنچا ۔ وہاں سے مازندران اور آخرکار یمگان میں پناہ لی ۔ درۂ یمگان کے پہاڑوں کے درمیان سکونت اختیار کی اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں اسی طرح مصروف رہا ۔

اس کی تبلیغ کے سبب ایران کے بہت سے اسماعیلی ''ناصریہ'' کہلانے لگے ، چناں چہ ''بیان الادیان''[۸] کے مؤلف نے اس کے متعلق اس طرح اشارہ کیا ہے :

''الناصریہ اصحاب ناصر خسرو ، و اوملعونی عظیم بودہ است و صاحب تصانیف . . . بہ یمگان مقام داشت و آن خلق را از راہ ببرد و آن طریقت او آنجا برخاست''[۹]

کرنے کی توفیق مانگی . . . . بحوالہ تاریخ ادبیات صفا ، II ، ۴۴۹ ۔

۷۔ براؤن نے پانچ حج لکھے ہیں (فارسی ترجمہ صفحہ ۳۳۵) ۔

۸۔ یہ کتاب ناصر خسرو کی وفات کے چار سال بعد تصنیف ہوئی اور اس کا مصنف اس کا ہم عصر تھا ۔

۹۔ بحوالہ دیوان ناصر خسرو مقدمہ لا ۔ ایک اور کتاب ''تبصرۃ العوام'' میں ہے : ناصریہ ، رئیس ایشان ناصر خسرو بود و این ملعون شاعر بود و خلق را گمراہ کرد'' بحوالہ صفا ۔ II ، ۱۸۴ ۔

زندگی کے آخری بیس پچیس برس اس نے یہیں بسر کیے ، تا آنکہ ۴۸۱ھ میں وفات پا کر اسی جگہ مدفون ہوا ۔

ناصر خسرو حافظ قرآن ہونے کے علاوہ اپنے عہد کے علوم متداولہ ، کیا علوم معقول و منقول اور کیا حکمت یونان وغیرہ سب میں بڑی دسترس رکھتا تھا ۔ علم کلام اور علم الٰہیات سے بخوبی آگاہ تھا ۔ ارسطو ، افلاطون اور فارابی و ابن سینا کے فلسفہ سے اسے پوری آشنائی تھی ۔ عربی و فارسی پر پورا عبور تھا ، غالباً ہندی کی بھی اسے کچھ شد بد تھی ، کتابوں سے اسے اس قدر لگاؤ تھا کہ سفر و حضر میں اپنی کتب اپنے ساتھ ہی رکھتا ۔ حتیٰ کہ عربستان سے ایران واپس آتے ہوئے کئی ایک دشوار مواقع پر اسے کتابیں اونٹ پر لاد کر خود پیدل چلنا پڑا ۔ مختلف مذاہب ——— ہندو مت ، مانویت ، صائبین ، نصاریٰ ، یہود ، زردشت وغیرہ سے اسے آگاہی تھی ۔ ان مذاہب کے متعلق اس کے دیوان میں اشارے ملتے ہیں ۔

تالیفات ناصر خسرو : اس کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے ، جن میں سے بقول آقائے تقی زادہ ، کچھ تصنیفات کے وجود کی حقیقت مجہول بلکہ مشکوک ہے ۔ مثلاً تفسیر قرآن جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عقاید اسماعیلیہ کے مطابق لکھی گئی ، کنز الحقایق وغیرہ ۔ اس کی مسلمہ تصنیفات میں سے چند اہم تصانیف یہ ہیں :

(۱) **سفرنامہ :** اس میں اس سفر کا حال ہے جس کا آغاز ، ایک خواب کی بنا پر ، اس نے ۴۳۷ھ ہیں کیا ۔

(۲) **زادالمسافرین :** اسماعیلی علم کلام کی اہم ترین کتاب ۔

(۳) **وجہ دین :** اہم مذہبی کتاب جس میں اس نے علم کلام کے مسائل ، تاویلات ، باطنی عبادات اور احکام شریعت ، اسماعیلی انداز میں لکھے اور اسماعیلی اصطلاحات استعمال کی ہیں ۔

(۴) خوان اخوان ۔

(۵) گشایش و رہایش ۔ اور

(۶) دیوان[۱۰] وغیرہ

ناصرخسرو کا شمار ایران کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے ۔ موجودہ دور کے ایرانی مؤرخین و ناقدین ادب کے مطابق وہ ایک ماہر قصیدہ گو[۱۱] ، بلا تردید شاعر توانا و سخن آور ، اور طبع نیرو مند ، سخن استوار و قوی اور اسلوب نادرہ و خاص

۱۰۔ تفصیل کے لیے مقدمہ دیوان ناصر خسرو ن ۔ سج ۔

۱۱۔ شفق ، ۱۴۴ ۔

کا مالک ہے[۱۲] ۔ یہ باتیں اس کی شاعری کی فنی حیثیت پر تو ضرور صادق آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شریعت کے لحاظ سے اس کی شاعری میں اتنی جاذبیت نہیں ہے ۔ ایاز فتح پوری کا یہ قول بالکل درست ہے کہ اس کا دیوان ''شعر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں چیز نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ وہ اسماعیلی تعلیمات کی انسائیکلوپیڈیا ہے ، بڑی اہمیت رکھتا ہے''[۱۳] درحقیقت جب شعر میں تبلیغ و خطابت کا زور ہو اور وہ بھی براہ راست منطقیانہ انداز میں تو اس میں لطافت ، تغزل ، چاشنی اور تاثیر کا عنصر بہت ہی کم رہ جاتا ہے ۔ ایسا شاعر چند ہی موضوعات تک محدود رہتا ہے اور اس کی شاعری میں گھرے اور نازک خیالات اور شاعرانہ ہیجانات کا فقدان ہوتا ہے ۔ حسن و زیبائی اور ماحول کی دل فریبی پر اس کی نظر کم ہی جاتی ہے جس کے سبب اس کا کلام ، فنی طور پر کتنا پختہ ہی سہی ، چند روکھی پھیکی منظوم نصائح کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ۔ ناصر خسرو کی شاعری بھی کچھ ایسی ہی ہے ۔

ناصر خسرو ایک بڑا صاحب علم و فضل شاعر تھا ، اس نے منطق اور یونانی فلسفے وغیرہ کا خاصا مطالعہ کیا تھا ۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب اس نے مختلف فرق و مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد اسماعیلی فرقے سے اپنا ناطہ جوڑا تو بڑی سرگرمی سے اس کی تبلیغ میں مصروف ہوا ۔ اسے ہم اُس کی اُس مے نوشی و عیش کوشی کا رد عمل کہہ سکتے ہیں جس میں وہ اپنے مشہور سفر سے پہلے مدتوں مبتلا رہا تھا ۔ اس رد عمل کے سبب وہ مذہب پر اس شدت سے کار بند رہا کہ اس سے ہٹ کر کچھ اور سوچ ہی نہ سکا اور غالباً اسی وجہ سے اس میں ایک روکھا پن اور دنیا سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا ۔ ان باتوں کا اس کی شاعری پر اثر انداز ہونا ایک بدیہی امر تھا ۔ پھر ان عوامل کے علاوہ یہ بات بھی اس کی شاعری میں تغزل و چاشنی وغیرہ کے فقدان کا باعث ہو سکتی ہے کہ اس نے پند و موعظت پر مشتمل موجودہ دیوان کا آغاز ، بگمان غالب ، ادھیڑ عمر (چالیس برس کے بعد) میں کیا ۔ اور یہ وہ عمر ہے جب انسان میں ایام جوانی والی شگفتگی و تازگی نہیں رہتی اور طبیعت میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہو جاتا ہے ، جس کے باعث انسان شگفتگی طبع کے اظہار سے مجتنب رہنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس کے دیوان کے مطالعے سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت وہ موسم بہار اور مناظر فطرت کی تصویر کشی کرکے ایسے اظہار کی کوشش کرتا بھی

۱۲- صفا ، II ، ۴۵۳ ۔
۱۳- مجلہ نگار علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر (۱۹۵۵ع) ۱۳۹ ۔

ہے تو گویا جلد ہی ڈر سا جاتا ہے اور پھر حسب عادت پند و موعظت کا دامن تھام لیتا اور ان مناظر کے حسن کو عبرت کا سامان بنا دیتا ہے :

چند گوئی کہ چو ہنگام بہار آید ۔۔۔ گل بیارآید و بادام بیار آید
روی بستان را چون چہرۂ دلبندان ۔۔۔ از شگوفہ رخ و از سبزۂ عذار آید
روی گلنار چو بزداید قطرہ ی شب ۔۔۔ بلبل از گل بسلام گلنار آید
راز دارست کنون بلبل تا یکچند ۔۔۔ زاغ زار آید و اُوزی گلزار آید
باغ راکز دی کافور نثار آمد ۔۔۔ چون بہار آید لؤلؤش نثار آید
گل سوار آید بر مرکب و یاقوتین ۔۔۔ لالہ در پیشش چون غاشیہ بردار آید
بید با باد بصلح آید در بستان ۔۔۔ لالہ با نرگس در بوس و کنار آید
باغ ماندہی گردون شود ایدون کش ۔۔۔ زہرہ از چرخ سحرگہ بنظار آید
اینچنین بیہدہ نیز مگو بامن ۔۔۔ کہ مرا از سخن بیہدہ عار آید
شصت بار آمدہ نوروز مرا مہمان ۔۔۔ جز ہمہ نیست اگر ششصد بار آید
سوی من خواب و خیالست جہان او ۔۔۔ کز بچشم تو ہمی نقش و نگار آید
نعمت و شدت او از پس یکدیگر ۔۔۔ حنظلش با شکر و با گل خار آید
روز رخشندہ کز و شاد شود مردم ۔۔۔ از پس اندہٗ و رنج شب تار آید
چو تو مدہوش بخاک اندر مُخسپی ۔۔۔ چہ بہار آید و چہ دشت ببار آید

یا مثلاً :

از میغ در بار زمین چون سما شد است
و ز لالہ ، سبزہ ہمچو سما پر ضیا شد است
گلبن چو برج جوزا گشت و گل بر او
بشکفت جای جای سماک وعوا[14] شد است
باردی بہشت باد صبا کوہ و دشت را
بر زخمہای باد مہ دی دوا شد است
این پیر گوز پشت کہن گشتہ شاخ گل
باز از صبا[15] بصنعت باد صبا شد است
نوروز توبہ بود جہان را کزو چنین
ہر بد کہ کردہ بود زمستان ہبا شد است
گر باغ تازہ روی و جوان گشت و خند خند
چون ابر نال نال و چنین با بکا شد است
چون دوزخی گر ابر سیاہ و پر آتش است
زو بوستان چرا کہ بہشتی لقا شد است

۱۴- قمر کی ایک منزل - ۱۵- بچپن -

زین پیشتر کلاه و دواج[۱۶] سپید داشت
اکنون وشی[۱۷] کلاه و بهائی قبا شد است

تا بینوا جهان به نوا گشت عندلیب
بر شادی از نوای جهان در نوا شد است

گر چه نوا و لحن نبد باغ راهگزر[۱۸]
آن بینوا و لحن کنون با نوا شد است

این نو شکوفه زنده سر از باغ بر زده
برما ز روز حشر و قیامت گوا شد است

آنست نیکبخت که پوشیده بین دلش
از حشر بر یقین بگواہی گیا شد است

اگرچہ اس نے خود پند و موعظت کے لیے شعر کا دامن تھام رکھا ہے لیکن اپنے مذہبی جنون کے سبب جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ، وہ غزل و مدح سرائی اور اس قسم کی شاعری کو برا کہتا ہے ۔

ای غزلگوی و لهوجوی ، ز من دور که من
نه ز اہل غزل و رود و فسوس ولهوم

چون تو از دنیا گوی و من از دین خدای
نه تو آن منی و نیز نه من آن تو ام

غزال و غزل ہر دوان مر ترا
نجویم غزال و نگویم غزل

من جز که بمدح رسول و آلش
از گفتن اشعار گنگ و لالم

گر میل کند سوی ہزل گوشم
با نگشت خرد گوش خود بمالم

تنگ دار از آنکه ہمچون جاہلان ، نوک قلم
بر مدیح شاہ یا میری قلم را تر کنی

فقط ایسے اشعار اس کے نزدیک قابل ستایش اور لائق تعریف ہیں جن میں زہد و طاعت ، پند و موعظت ، حکمت ، منقبت اولیاے حق یا اماموں پر وارد شدہ مصائب کا بیان ہو ۔ اس کے دیوان میں جگہ جگہ پند و موعظت کے موتی بکھرے

۱۶- لحاف ۔ ۱۷- ریشم کی مانند عمدہ کپڑا ۔
۱۸- ہرگز ۔

نظر آتے ہیں ۔ مثلاً :

''دروغ گوئی سے بچو کہ عاقلوں کے نزدیک یہ زبان کا زنا ہے ۔ ہر وقت راست گوئی اختیار کرنی چاہیے تا کہ سوگند کی ضرورت نہ رہے ۔ دروغ ''گند'' ہے اس سے دور رہے تا کہ تمہارا منہ گناہ سے بچا رہے (دیوان صفحہ ۹۰) مکر و حسد سے احتراز کرو کہ یہ وبال و بلا ہیں ۔ نرمی سے بات کرنی چاہیے کہ تیزی سے دل و جان کو رنج پہنچتا ہے ۔ نیز نرمی سے بہت سے دل رام ہو جاتے ہیں اور تیزی بڑے بڑے پختہ عقل لوگوں کو بھی خامی کا شکار بنا دیتی ہے . . .'' ۵۱۵ ۔

لیکن کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ یہی ناصح شاعر جب اپنے مخالفین کا ذکر کرتا ہے تو انھیں ایسی ایسی گالیوں سے یاد اور خطاب کرتا ہے کہ اس کا ایک غیر جانبدار قاری بھی اس کے زہد و ورع سے بد ظن ہو جاتا ہے ۔ غیر اسماعیلیوں کو وہ ''ناصبی'' کے لفظ سے پکارتا ہے (جن میں حنفی ، اہل سنت ، مالکی ، حنبلی وغیرہم آتے ہیں) ۔ ''ناصبی'' پر دیگر سینکڑوں اشعار کے علاوہ پورا ایک قصیدہ لکھا ہے ۔ ان اشعار میں کہیں وہ انھیں ''خر'' بلکہ خر سے بھی بدتر کہتا ہے اور کہیں ابلیس لعین کے ہمراہی ۔ بقول اس کے یہ حیوان لوگ اپنی جہالت و سفاہت کے سبب شہرت کے مالک ہیں (صفحہ ۱۰۰) علم فروش علما (مراد مخالف علما) کے پر و بال عقاب کے سے ہیں اور حرص میں وہ جنگلی سور کی مانند ہیں ۔ (صفحہ ۲۰۲)

آگے چل کر کہتا ہے کہ مئے جوشیدہ صاحب رائے (امام ابو حنیفہ) کے نزدیک حلال ہے ۔ شافعی شطرنج کو مباح کہتا ہے ۔ ''کودک سادہ زنخ'' کی صحبت کو مالک نے جائز قرار دیا اور اس کا جواز پیش کیا ہے ۔ گویا تین اماموں کے طریق میں مے و قمار و لواطت تجھے (ناصبی) حلال ہیں ۔ شاباش ! سربلند رکھ ۔ اگر یہی دین خدا اور یہی حق و صواب ہے تو پھر تمام دنیا میں نہ کوئی ''محال'' ہے نہ کوئی ''مجاز'' ۔ ان لوگوں نے دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اگر ترک طراز (کافر) ہم پر فتح پا لے تو وہ اس کا آدھا بھی نہیں کرے گا ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ لوگ اماموں (ابو حنیفہ ، مالک وغیرہم) کی طرح سب کے سب مسخرے ، مطرب اور طرار و طناز ہو گئے ہیں[۱۹] ۔ (صفحہ ۲۰۲)

آخری ایام میں اس کی مخالفت بہت بڑھ گئی تھی جس کے سبب اسے یمگان

۱۹۔ ایک اور جگہ چاروں اماموں کے ساتھ مذکورہ باتیں منسوب کرکے کہتا ہے ۔ لہٰذا شراب اور بھنگ پیو ، (برا فعل کرو) اور جؤا کھیلو کہ مسلمانی ان چار اماموں پر ختم ہو جاتی ہے ۔ (صفحہ ۵۰۵)

میں گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی ۔ اس کا ذکر اس نے بہت سے مقامات پر کیا ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :

''میں ابوحنیفہ کے لشکر کے ڈر سے قلعہ (یمگان) میں بے چارہ و در ماندہ پڑا ہوں ، کیونکہ تیرے رسول (صلعم) سے دوستی کے باعث میں اس (ابو حنیفہ) کے لشکر کے نزدیک گنہگار ہوں . . . روز محشر تو اس بے لگام گایوں کے ریوڑ کے خلاف میری داد کو پہنچنا اور انصاف کرنا ۔ میں اس گمراہ حیوانوں کے گلے کے ساتھ ہرگز نہیں چاوں گا کہ میں گدھا نہیں ہوں ۔ اگرچہ میں خوب و خوش سخن کے باعث عزیز و خوشگوار کھجور ہوں لیکن ان عوام کے نزدیک خاک کی طرح خوار ہوں ، کیونکہ ان کی اندھی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہوں ۔ ان گمراہ بھیڑیوں اور ریچھوں سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں ۔'' (صفحہ ۲۷۶)

اپنے عقاید میں حد درجہ متعصب اور انتہا پسند ہونے کے باعث جہاں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اپنی بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار کرتا اور ان کا نام نہایت احترام سے لیتا ہے ، وہاں دوسرے خلفاء رضوان اللہ علیہم بالخصوص حضرت ابوبکر و حضرت عمر کا ذکر بے حد بھونڈے انداز میں کرتا ہے ۔ شریعت و خلافت کو وہ جاگیر قرار دیتا ہے جس کے حقدار ، بقول اس کے ، صرف حضرت علی تھے ۔ اس سلسلے میں وہ جو دلیلیں پیش کرتا ہے وہ وہی ہیں جو کسی جاگیر کے وارثوں کے حق میں دی جاتی ہیں ۔

شریعت و خلافت کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ لوگوں کا یہ کہنا کہ پیغمبر (صلعم) نے رحلت کے وقت امت و دین فلاں فلاں کو سونپا ، یہ غلط ہے ۔ ان جاہلوں کو خبر نہیں کہ پیغمبری تو ''ملک الہی'' ہے جو قیصر و خاقان کی مملکت سے بڑھ کر ہے تو جب کسی بھی بادشاہ نے اپنا ملک کسی غیر کے حوالے نہیں کیا (اور تاریخ عالم اس کی شاہد ہے) اور کسی ہی مسلمان نے اپنی میراث اپنی دختر ، اپنے داماد اور نواسے کے علاوہ کسی اور کو نہیں دی تو پھر (شریعت و خلافت کیوں کسی غیر کو سونپی جائے)[۲] ۔ آگے چل کر کہتا ہے :

''یا پھر ہمارے (یعنی مخالفین) خیال کے مطابق رسول (صلعم) نے خداوند بزرگ

۲۔ ایک اور جگہ کہتا ہے :

رہ سترِ یزدان کہ داند ، پیمبر
پیمبر بکہ سپرد این سر ، بحیدر (دیوان صفحہ ۱۶۹)

کے قول پر عمل نہیں کیا[۲۱] ۔ تمھارے تو مغز میں آتش عصیاں کا دھواں بھرا ہے ۔ کس لیے ایسی خام باتیں کرتے ہو ، وہ دن آنے والا ہے جب تم اپنی اس بیہودہ گفتار کے باعث حسرت و غم کے مارے اپنے دانتوں سے پتھر چباؤ گے لیکن اس روز یہ حسرت و پریشانی بے سود ہوگی ۔ فرزند نبی (صلعم) نے اپنے جد کی جگہ لی ہے ۔ برگزیدہ وہی ہے جسے خدا چنے ۔ تم لوگ اس سلسلے میں خواہ مخواہ بیہودہ و بے سرو پا باتیں کر رہے ہو (صفحہ ۳۵۲ ، ۳۵۳) ۔

ناصر خسرو کے نزدیک اسلام کی ''اصل'' دو چیزیں ہیں ۔ قرآن اور ذوالفقار ۔ بقول اس کے ، اس میں نہ تو کسی مسلمان کو اختلاف ہے اور نہ کسی مشرک ہی کو[۲۲] ۔ اس کا کہنا ہے کہ احمد مختار شمس ہیں اور حیدر کرار نور ۔ یہ اس کے بغیر موجود نہیں اور وہ اس کے بغیر با انوار نہیں ۔ خدا نے آنحضرت کے دل میں جو خزانہ رکھا اس کے نگہبان حضرت علی ہی ہیں (صفحہ ۷۸) ۔ اس کے مطابق حربگاہ میں ہمارے پیغمبر (صلعم) کے پاس سب سے قوی معجزہ حضرت علی کی قوت ہوتی تھی (صفحہ ۲۱۵) ۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ، اسماعیلیوں کی تمام تر توجہ ظاہر کی بجائے باطن کی طرف ہوتی تھی ، اسی کی وہ تعلیم دیتے اور اس کے لیے مختلف تاویلوں سے کام لیا کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں وہ اپنے پیروکاروں کو آغاز کار ہی میں فلسفہ کی جانب مائل کرتے اور تبلیغ کے اعلیٰ مرحلوں میں وہ فلسفہ اور دین کو ایک دوسرے کا ہم پلہ قرار دیتے تھے ۔ چنانچہ ناصر خسرو کے بھی بیشتر اشعار ایسے ہی موضوعات —— حصول علم و حکمت پر زور ، دین اور باطن کی طرف توجہ ، عقل و خرد اور تاویلات کا ذکر پر مشتمل ہیں ۔ اس کے نزدیک یہ علم و حکمت اور قرآن کے باطنی معنی صرف حضرت علی سے جو مدینۂ علم کے دروازے ہیں یا

۲۱۔ کسی دوسرے مقام پر کہتا ہے : دین خدا ، ملک رسول ہے . . . اگر کسی آدمی کی جائداد اس کی اولاد کو ملتی ہے تو پھر پیغمبر (صلعم) کی شریعت اس کی اولاد کو کیوں نہ پہنچے (۲۱۴) ۔ دختر و داماد اور چچیرے بھائی کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان نے اپنی میراث کبھی کسی دوسرے کو دی ہے ؟ (صفحہ ۵۰۵)

۲۲۔ ایک اور جگہ یوں کہتا ہے :

قرآن بود و شمشیر پاکیزہ حیدر — دو بنیاد دین متین محمد
کہ استاد با ذوالفقار مجرد — بہر حربگہ بر یمین محمد
چو تیغ علی داد یاری قرآن — علی بود بے شک معین محمد

(دیوان صفحہ ۱۰۳)

امام وقت سے سیکھے جا سکتے ہیں ۔ دوسرے سب اس سے بے بہرہ ہیں ۔ ان کے سامنے جب کوئی مشکلات قرآنی یا دوسرے مسائل رکھے جاتے ہیں تو وہ ان کے حل سے عاجز ہوتے ہیں ۔ جہاں بھی اس نے ''عاقل و خرد مند'' کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے معنی ایک ''اسماعیلی'' کے ہیں اور علم و عقل و خرد سے اس کی مراد علم باطن ہے ۔ غرض کہ شاید ہی اس کا کوئی ایسا قصیدہ ہوگا جس میں اس نے علم و حکمت وغیرہ کا ذکر نہ کیا ہو ۔ اس سلسلے میں اس کے خیالات اس قسم کے ہیں :

انسان کو خدا نے بقا کے لیے پیدا کیا ہے ۔ یہ بقا علم ، خدا ، رسول اور قرآن سے ہے ، اور قرآن کا ایک خاص گھر ، دروازہ اور چابی ہے ، اگرا نسان کو علم و بقا کی ضرورت ہے تو اسے چاہیے کہ وہ دروازے کی طرف جائے اور دربان کو ڈھونڈے ۔ اس گھر کا دروازہ لکڑی کا نہیں ہے ، بلکہ یہ دروازہ وہ دانا ہستی ہے کہ جس سے بہتر خدائے سبحان کا کوئی اور بندہ نہیں ہے ۔ (صفحہ ۱۰) ۔ اگر آدمی آموختن (حصول علم) سے منہ نہ موڑے تو اس کا سر ''سروری'' پا لے ۔ اگر وہ دانش حاصل کرے تو چرخ نیلو فری کو نیچے لے آئے (صفحہ ۱۳) اے انسان اگر تو علم نہیں سیکھے گا تو ماں باپ کی طرح رسوا ہوگا ، اگر تیرا قامت دانش پست ہو تو تیرا قد سرو کی طرح ہی کیوں نہ ہو ، بالکل بے سود ہے (صفحہ ۱۸ ۔) طاعت و دانش کے ساتھ پرہیز اختیار کیا جائے تو انسان آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے (صفحہ ۱۹) ۔

''گفتار'' عقل سے ہوتی ہے جس کے پاس عقل نہیں وہ گائے ، خر اور خچر کی مانند ہے ۔ وہ شخص اصل میں ''صاحب سخن'' ہے جس کے پاس ''برہان و بیان'' کو ظاہر کرنے والی عقل ہو (صفحہ ۲۵) ''طرب'' کی ضرورت ہو تو انسان کو علم و حکمت طلب کرنا چاہیے ۔ علم و حکمت کی شاخ تک تم ''رطب'' کو بہر طرب پاؤ گے ۔ یہ جو ہای وہو اور ہر لمحہ پاکوبی کرنے والے لوگ ہیں یہ حق کے دیوانے ہیں (ان کے اس فعل کو) ''طرب'' نہیں کہنا چاہیے (صفحہ ۳۶) انسان اور حیوان میں امتیاز علم و طاعت ہی سے ہے (صفحہ ۳۷) اس علم کی طرف کوئی شخص راہ نہیں پا سکتا جب تک اس میں عمل کا مادہ نہ ہو ، کہ خدا نے آیات قرآنی میں عمل پر ہی خطاب کیا ہے اور عمل ہی کے ثواب کا وعدہ پورا ہوگا ۔ جب رکاب نہ ہو تو آدمی سواری نہیں کر سکتا ۔ علم کے بغیر آدمی اس ''بند عظیم'' سے رہائی نہیں پا سکتا جو تنزیل (قرآن) کے اندر حجاب میں مخفی ہے اور جب تک انسان اس کی تاویل نہیں پائے گا اس کے علم تک نہ پہنچ سکے گا ۔ (صفحہ ۴۱) ۔

نافۂ مشک پہلے ایک قطرہ خون ہوتی ہے اور چمکدار موتی شروع میں پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے ۔ (کچھ یہی کیفیت انسان کی ہے یعنی) علم و عمل اسے

''لولوی خوش آب'' کی مانند بنا دیتا ہے ۔ انسان کو اپنا جبہ و دامن زربفت کا بنانے کے لیے جدوجہد کرنے کی بجائے اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا دامن و جیب پاک رہے کہ زیور و زینت تو عورتوں کے لیے ہے اور مرد کا زیور علم و ادب ہے (صفحہ ۴۲) اہل خرد جبر اور قدر کے درمیانی راستے پر چلتے ہیں ۔ دین کا صحیح راستہ وہی ہے جسے خرد پسند کرے ، اور خرد اہل زمین کے لیے خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے ۔ خرد وہ چیز ہے کہ جب انسان اس کی راہ پر چلے تو اس کی خاک سے موتی اگنے لگیں ۔ خرد ہی کی بدولت انسان خدا کے خطاب و ثنا کا اہل بنتا ہے ۔ خرد ہر قسم کے خلل اور غم سے خالی ، خوف سے دور اور ہر درد کی دوا ہے ۔ دنیوی معاملات میں یہ ایک مخلص دوست اور اسلحہ ہے اور راہ دین میں عمدہ اسلحہ و عصا ہے ۔ بے خرد آزاد ہونے کے باوصف مقیّد اور باخرد مقیّد ہونے کے باوجود آزاد ہے (صفحہ ۴۶ ، ۴۷) تن جان سے اور جان علم سے زندہ ہے ۔ دانش انسانی جان میں گوہر ہے ۔ (صفحہ ۴۸) جان کو علم سے دھونا چاہیے کہ یہ اس (جان) کے لیے ایک مبارک صابون ہے ۔

ناصر خسرو کے نزدیک فقہ اور اس کا علم ، مکر و حیلہ ہے ، ہر وہ دانا جو حیلہ جو اور مکار نہیں ہے ، اس کی طرف توجہ نہیں کرتا ۔ اس علم فقہ کو ، بقول اس کے اگر غول شہر کہا جائے تو عین مناسب اور اگر دیو دہر (شیطان زمانہ) کہا جائے تو استغفار کی ضرورت نہیں ۔ یہ گویا علم کو خرد برد کرتا ہے اور خرد برد کرنا گاہوں اور گدھوں کا کام ہے ۔ دانا ان بیہودہ کاموں کی جانب رخ نہیں کرتے (صفحہ ۷۷) ۔ صاحب عقل و خرد گوہر ہے اور یہ دنیا دریا ۔ وہ (صاحب خرد) دنیا کے بے شمار جاہلوں کو دیکھ کر گھبراتا نہیں ، اس لیے کہ دریا میں موتیوں کی نسبت پتھر زیادہ ہوتے ہیں ۔ خرد مند ، تخم و میوہ ہے ، دوسرے لوگ خار و خس ہیں (صفحہ ۸۶) ۔ عاقل کے سوا کوئی مرد نہیں ۔ بے دانش اگرچہ شکل و صورت سے مرد نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔ صرف خرد مند ہی فلک پر اڑ اور دریا پر چل سکتا ہے ۔ عقل و خرد کے لیے ایسی ہستی کے پاس جانا چاہیے جو خرد کے خزانے اور خدائی علم کا دروازہ ہے ۔ اور دانا کے نزدیک جس کا دل دریائے خرد ہے ۔ وہ دریا ہے اور ساری دنیا شمر ۔ اگر کسی کو آتش دوزخ کا خوف ہے تو اسے اس ہستی کے ایمان کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ اس کا ایمان آتش دوزخ کے لیے ڈھال ہے ۔ ہنر اور فضل و خرد اس کی سیرت میں ہے (صفحہ ۸۷) ۔

ایک جگہ کہتا ہے کہ جب تک انسان لطیف و کثیف میں تمیز نہ کر سکے اس وقت تک وہ قفس آہنی میں مقید رہتا ہے ۔ یہ علم و دانش شیطان کے دوستوں تک نہیں پہنچ سکتا ، جس طرح آگ پر یاسمین نہیں کھل سکتی ۔ اشرف المسلمین

رسول خدا (صلعم) کا فرمان ہے ''علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے'' ۔
امام خانۂ اسرار خداوندی ہے ، روح الامین اس کے بہت قرین ہیں ، جب تک کوئی شخص اس (امام) کا ''رسن عہد'' نہیں تھامے گا شیطان لعین اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا ۔ علم اس کے سوا اور کہیں نہیں ملے گا ، جس طرح شیر جنگل کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا ۔ جو کوئی بھی اس کے حضور کا رخ کرتا ہے اس کی جبین پر زہرہ و سہیل چمکنے لگتے ہیں ۔ (صفحہ ۳۵۲) فاطمی[۲۳] خلیفہ ہر زمان اسلام کو تازہ کر رہا ہے ، وہ امام ابن امام اور علم یزدان کی شاخ کا میوہ ہے ۔ وہ علم ، حلم ، حکم اور عدل میں کامل ہے ۔ اس کے علم کی نردبان کے بغیر پُر نور بام تک رسائی نہیں ہو سکتی (صفحہ ۲۹۹) ۔

تاویل کے ایک لغوی معنی ہیں کسی کلام کو اس کے ظاہری معنوں سے ہٹ کر ایسے معنی میں ڈھالنا جن کا احتمال ہو ۔ اور اس لحاظ سے کہ یہ لفظ ''اول'' سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں ''گردانیدن کلام ، بسوی اول و بیان کردن از عبارتی بعبارت دیگر[۲۴]'' ۔ اسماعیلیوں کے یہاں تاویل کا لفظ اپنے اول الذکر معنی میں استعمال ہوتا تھا ، یعنی کلام کے ظاہری معنوں کی بجائے اس کے احتمالی یا باطنی معنوں پر زور ، اور ان کی تمام تر توجہ اسی امر پر مبذول رہتی تھی کہ یہ ان کے مذہب کا ایک اہم رکن تھا ۔ دین کی تاویل ، قرآن کی تاویل ، شریعت کی تاویل وغیرہ ۔ ناصر خسرو نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ تاویل کی اہمیت و ضرورت کا ذکر مختلف انداز میں کیا ہے ۔

بقول اس کے علم تاویل ، دوشیزۂ نہاں ہے ، جس طرح برگ حنظل کے اندر حنظلہ ۔ یہ علم حق ہے ، اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے (صفحہ ۳۸۵) ۔ جو کوئی بھی تنزیل کو بغیر تاویل کے پڑھتا یا اس پر چلتا ہے وہ دین کے معاملے

۲۳۔ فاطمیوں کے متعلق اس نے بہت کچھ کہا ہے ۔ مثلاً دین محمد کی مثال ایک جسد کی ہے اور اس جسد پر فاطمی سر کی مانند ہیں ۔ جب شب دین سیاہ و تاریک ہو تو فاطمی ماہ ، زہرہ اور ستارۂ صبح ہیں ۔ ان کے پدر (علی) نے تمام خلق دنیا میں انصاف پھیلایا ۔ اگر بیٹے باپ کی طرح داد گر ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں (صفحہ ۱۰۰) (اے مخاطب) فاطمیوں کی پیروی کر کہ فرمان خداوندی کے سلسلے میں وہ اپنے جد و پدر کے بعد اُمتوں کے راہبر ہیں ۔ ان کے جد ، خدا کی طرف دیو و پری و مردم کے رہبر تھے اور بیٹے اسی جوہر سے ہیں ۔ اگر کسی کا بیٹا اس کے جسم کا جگر ہے تو فاطمی ''حقیقت'' میں نبی و علی کے جگر ہیں (صفحہ ۱۰۱) ۔

۲۴۔ غیاث اللغات ، صفحہ ۱۳۲ ۔

میں دائیں آنکھ سے بھینگا ہے - لفظ "مشک" ہیں اور معنی ان کی بو - اگر مشک میں خوشبو نہ ہو تو وہ خاکستر ہے (صفحہ ۹۳) دین کا ظاہر اس کا جسم ہے اور تاویل اس کی روح - ظاہر ہے کوئی جسم روح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا (صفحہ ۵۳) - یہ علم (تاویل) مصقلہ ہے اور بجز اس کے کوئی چیز زنگ جہل کو نہیں مٹا سکتی - یہ علم تنزیل میں ہے اور اس علم میں "مشلہائے قرآن" تاج کی مانند ہیں . . . (صفحہ ۳۸۵) - قرآن ، میدانِ خدا ہے جو کوئی سوار ہے اس سے کہو کہ وہ اٹھے ، آگے آئے اور میدان میں گھوڑا دوڑائے : کون ہے جو اس کے حرف متشابہ کے پشتے پر اپنا گھوڑا دوڑا کر لے آئے ؟ قرآن کا پڑھ لینا تو نہایت آسان ہے لیکن اس کی تاویل کا حاصل کرنا دشوار ہے -

ناصر خسرو کے نزدیک تاویل کے بغیر قرآن کا پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈھور ڈنگر گھاس دانہ کھا رہا ہو - پھر کہتا ہے کہ یہ جو بات میں نے کہی ہے یہ حضرت بوذر نے حضرت سلمان سے کہی تھی - آگے چل کر ایک اور مثال دیتا ہے کہ اس طرح (بغیر تاویل) قرآن کا پڑھنا اخروٹ کو چھلکے سمیت کھانا ہے اور یہ فائدہ مند نہیں ، بلکہ اس سے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے - اس لیے ایسا کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے - اس کے مطابق کلام اللہ کے معنی صرف پیغمبر (صلعم) جانتے ہیں اور اس کی اشکال کو حل کرنے کی قدرت و قوت سوائے آل نبی کے اور کسی کو نہیں[۲۵] - تاویل کے بغیر قرآن پڑھنے والوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تو جو بصد حیلہ و تقلید قرآن پڑھتا ہے تو یہ اس پرندے کی مانند ہے جو دستان[۲۶] سیکھتا ہے - تیرا اس طرح قرآن پڑھنا سخن مرغ کی طرح بے حاصل ، بے معنی اور بے حجت و برہان ہے ؛ جس چیز کو تو پڑھے اور نہ سمجھے اس سے فغان کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا (صفحہ ۳۵۴) - وہ لوگ جن کا مذہب صرف قرآن کو پڑھنا اور اس کی تاویل سے اجتناب کرنا ہے ، ان کا مذہب "مذہب طوطی" ہے (صفحہ ۴۸۷) قرآن کی تاویل صرف اس ہستی کے خزانے سے مل سکتی ہے جس کا خلق میں کوئی ثانی نہیں -

---

۲۵- ایک اور جگہ کہتا ہے کہ دین حق نے قرآن کی پود میں ان (آل نبی) سے تارِ تاویل بُنا - سوائے ان کے چشم دانا آشکار کے نیچے نہاں نہیں دیکھ سکتی (صفحہ ۴۲۵) -

۲۶- مکر و حیلہ ، نغمہ و سرود ، افسانہ -

تبصرے

تذکرہ روضۃ السلاطین جواہرالعجائب مع دیوان فخری ہروی تالیف محمد فخری ہروی بہ تصحیح و تحشیہ سید حسام الدین راشدی ۔ ناشر : سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۔

صفحات : ۸۷ + ۳۴۲ **قیمت : ۲۰ روپے**

فارسی شعراء کے یہ دونوں تذکرے سر زمین سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں لکھے گئے ۔ پہلا تذکرہ یعنی روضۃ السلاطین ان امراء و سلاطین کا تذکرہ ہے جو شاعر تھے اور جواہرالعجائب خاتون شعراء کے حالات پر مشتمل ہے ۔ ان کا مصنف محمد فخری ہروی ہے جو ارغونوں کے عہد میں ہرات سے سندھ آیا اور یہیں آباد ہو گیا ۔

تاریخوں میں روضۃ السلاطین کے مصنف کے متعلق کوئی صحیح اطلاع موجود نہ تھی بلکہ اسے کسی اور شخص کی تصنیف قرار دیا گیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس تذکرہ کا نسخہ دستیاب نہ تھا ۔ سید حسام الدین راشدی کو اتفاق سے اس کا ایک نسخہ مل گیا جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس کا اصل مصنف شاہ حسین تکدری نہیں بلکہ فخری ہروی ہے ۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف کتب خانوں سے اس کے بعض دوسرے نسخے حاصل کیے اور ان کی مدد سے موجودہ تذکرہ کی تصحیح کی ۔

جیسا کہ مؤلف نے بیان کیا ہے مطالب کے لحاظ سے یہ تذکرہ بڑا قابل قدر ہے ۔ بعض سلاطین اور امرا کے کچھ حالات یہاں ملتے ہیں جو کسی اور جگہ دستیاب نہیں ۔ بعض ایسے سلاطین کا ذکر کیا گیا ہے جن کا حال کسی اور جگہ درج نہیں اور کئی ایسے بادشاہوں کے متعلق صرف اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر کہے ہیں ۔

جواہر العجائب جو خواتین شعراء کا تذکرہ ہے وہ بھی فخری ہروی کی تصنیف ہے اور روضۃ السلاطین کی طرح سندھ میں لکھا گیا ۔ مؤلف نے اس کے بھی مختلف نسخے حاصل کرکے اس کی تصحیح کی ہے ۔ فارسی ادب میں یہ پہلا تذکرہ ہے جو شاعر عورتوں کے لیے مختص ہے ۔

ابتدا میں مؤلف نے فخری ہروی کے حالات و آثار پر کافی مواد پوری تحقیق سے جمع کیا ہے ۔ اس کی تصنیفات کا مکمل تذکرہ و تفصیل مہیا کی گئی ہے ۔ ان دونوں تذکروں کے بعد مؤلف نے فخری ہروی کی ایک سو ایک غزلیں بھی محفوظ کر دی ہیں جو تحفۃالحبیب اور محک مرتضائی سے لی گئی ہیں ۔ اس کا دیوان ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ۔

کتاب کا اہم ترین حصہ وہ تعلیقات ہیں (۱۸۳ - ۲۰۵) جن میں مؤلف نے بڑی محنت و کاوش سے بہت قابل قدر مواد جمع کر دیا ہے ۔ جہاں جہاں مصنف کتاب (یعنی فخری ہروی) سے واقعات کے بیان کرنے میں سہو ہوا ہے ، مؤلف نے مستند تاریخوں کے حوالے سے تعلیقات میں ان کی تصحیح کر دی ہے ۔ مثلاً دیکھیے صفحہ ۱۹۳ تعلیقات ، متعلق روضۃ السلاطین صفحہ ۱۳ ۔

اکثر جگہ مصنف نے انتہائی اختصار سے کام لیا تھا ۔ مؤلف نے تعلیقات میں کوشش کی ہے کہ اس کمی کو پورا کیا جائے ۔ مثلاً ہمایوں (صفحہ ۵۶ - ۵۷) کے ذکر میں متن میں صرف تین سطریں درج ہیں اور صرف دو رباعیاں نقل کی ہیں ۔ مؤلف نے تعلیقات میں (۲۳۵ - ۲۴۴) ہمایوں کے کلام کے نمونے مختلف ماخذوں سے پیش کر دیے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو اس کے کلام کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہو سکے ۔

روضۃ السلاطین کے باب پنجم کا (صفحہ ۸۱) آغاز سلطان فیروز شاہ سے ہوتا ہے ۔ حاشیہ میں مؤلف نے لنن گراڈ کے نسخے کی مدد سے سلطان غیاث‌الدین بنگالہ کا ذکر بھی نقل کر دیا ہے جس کا ذکر بعض کے نزدیک خواجہ حافظ شیرازی نے ایک غزل میں کیا ہے ۔

مؤلف نے تعلیقات میں (صفحہ ۲۷۳) اس واقعہ پر بحث کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حافظ شیرازی نے جس غیاث الدین کا ذکر کیا ہے وہ بنگال کا نہیں بلکہ ایران ہی کا تھا ۔ اس دعوے کا دار و مدار ڈاکٹر قاسم غنی کی کتاب ”عصر حافظ“ پر ہے جہاں ڈاکٹر صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ حافظ کا ممدوح سلطان غیاث الدین محمد پسر بزرگ سلطان عمادالدین احمد بن امیر مبارزالدین محمد تھا ۔ مولانا شبلی نے اور ان کے تتبع میں ایڈورڈ براؤن نے اس کو بنگال کا سلطان غیاث الدین سمجھا ہے حالانکہ شبلی نے کہیں اپنا ماخذ بیان نہیں کیا اور شاید ان کو حافظ کے ایک شعر سے اشتباہ ہوا ہے جس میں بنگال کا ذکر تھا ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

(بحث در آثار و افکار و احوال حافظ جلد اول ، طہران ۱۳۲۱ صفحہ ۳۲)

فاضل مؤلف نے اس کی تائید میں چند اور شواہد پیش کیے ہیں ۔

(۱) بنگالے کا حکمران سلطان غیاث الدین ۷۹۲ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور حافظ کی تاریخ وفات ۷۹۱ھ ہے ۔ اس لیے حافظ کا سلطان غیاث الدین بنگالہ کو غزل بھیجنا ممکن نہیں ۔

(۲) حافظ کی غزل میں بنگالے کا ذکر محض تجارتی تعلقات کی طرف اشارہ ہے اور ''قند فارس'' الھی اشیائے تجارت میں سے تھی ۔ مؤلف نے اس سلسلے میں دو اشعار بھی نقل کیے ہیں جن میں شکر اور قافلہ ہند کا تذکرہ موجود ہے ۔

(۳) تیسری شہادت یہ دی ہے کہ لینن گراڈ کے نسخے کے علاوہ سلطان غیاث الدین کا ذکر تذکرہ روضۃ السلاطین کے کسی اور نسخے میں موجود نہیں ۔

اس تمام استدلال میں چند شبہات ہیں جو ذیل میں پیش کرتا ہوں ۔

(۱) ڈاکٹر قاسم غنی کی رائے کے مطابق جس غیاث الدین کا ذکر حافظ نے کیا ہے وہ کرمان کا تھا بنگالے کا نہ تھا ۔ مگر جو شہادت ڈاکٹر صاحب نے پیش کی ہے اس کے مطابق کرمان کے حکمران کا نام سلطان غیاث الدین محمد تھا ، محض سلطان غیاث الدین نہ تھا ۔ حالانکہ حافظ کی غزل میں صرف سلطان غیاث الدین کا ذکر ہے ۔ حافظ نے قصائد ، قطعات یا غزلوں میں جہاں بھی اپنے ممدوحین کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا پورا نام لیا ہے ۔ کیا وجہ ہے کہ یہاں حافظ نے سلطان غیاث الدین محمد کی بجائے صرف سلطان غیاث الدین کا ذکر کیا ہے جو بنگال کے حکمران یا شاہزادے کا نام تھا ؟

(۲) لفظ ''بنگالہ'' جو حافظ کے شعر میں موجود ہے اس کی تشریح ڈاکٹر عبدالغفور کے ایک مضمون (مندرجہ پارس) کے حوالے سے یوں کی گئی ہے کہ اس سے مراد محض وہ تجارتی تعلقات ہیں جو ایران اور ہند میں اس وقت تھے لیکن ایران کے تجارتی تعلقات تو سندھ ، بنگال اور ہندوستان کے کئی دوسرے علاقوں سے بھی تھے ۔ لفظ بنگالہ کے خصوصی استعمال کی تو یہ توجیہ نہیں ہو سکتی ۔ پھر جس شعر میں لفظ ''بنگالہ'' موجود ہے اس شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ہند بھی موجود ہے ۔ چنانچہ ''ہند'' کی موجودگی میں ''بنگالہ'' کا ذکر محض ''ہند'' کو ظاہر کرنے کے لیے نہیں ہو سکتا ۔ اس میں ''بنگالہ'' کی خصوصیت ضرور ہے ۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

پھر ''قافلہ ہند'' اور ''شکر'' کے حوالوں سے یہ مسئلہ کسی طرح بھی حل نہیں ہوتا ۔

مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع میں ''قند پارسی'' سے مراد کیا واقعی ''قند'' ہے جس کو فاضل مؤلف نے ''قند فارس'' (قند فارسی نہیں) کا نام دے کر ''شکر'' کے طور پر پیش کیا ہے ؟ حافظ کے شعر میں ''قند پارسی'' سے مراد

کسی طرح بھی ''قند'' نہیں بلکہ اشعار ہیں ۔

(۳) اس غزل کا ایک شعر ہے :

طے مکان ببیں و زمان در سلوک شعر
کاین طفل یکشبہ رہ یکسالہ می رود

اس شعر میں ''طفل یک شبہ'' اور ''رہ یک سالہ'' کی ترکیبیں غور طلب ہیں ۔ اگر ڈاکٹر قاسم غنی کی روایت تسلیم کر لی جائے اور سلطان غیاث الدین کو کرمان کا حکمران ہی سمجھ لیا جائے تو کیا شیراز سے کرمان پہنچنے کے لیے ایک سال کی مدت چاہیے ؟

یہ چند اقتباسات ہیں جو بادی النظر میں سامنے آ گئے ۔ ان کا فیصلہ محققین کا کام ہے ۔

انوار مجددی مؤلفہ جناب یوسف سلیم چشتی عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور صفحات ۴۸۳ ۔ قیمت ۴ روپے

پروفیسر سلیم چشتی صاحب نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے چند مکتوبات کا خلاصہ پیش کیا ہے ۔ ابتدا میں مجدد صاحب کی زندگی کے حالات درج ہیں ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اس کتاب کی تحریر کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مجدد صاحب نے وحدت وجود کے خلاف جو کچھ لکھا تھا بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا ۔ اس دعوے کے ثبوت میں فاضل مترجم نے بعض بلاواسطہ دلائل دینے کی ضرور کوشش کی ہے لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکے کہ واقعی مجدد صاحب نے وحدت وجود کی مخالفت ترک کر دی تھی اور اُس مسلک کے حامی ہو گئے تھے جو شیخ اکبر نے مثلاً فصوص الحکم میں پیش کیا ہے جس کے فص توحیہ میں شرک کی واضح حمایت کی گئی ہے ۔ مجدد صاحب کے مکتوبات اس معاملے میں بالکل واضح ہیں اور ان کی تمام اجتہادی کوشش کا محور یہی تھا کہ ہر وہ تحریک جو دین میں رخنہ ڈال سکے ختم کر دی جائے ۔ ایک طرف فاضل مترجم نے اکبر کو ''اکبر مرتد'' لکھنے پر زور دیا ہے اور اپنے اس جوش میں اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں تو دوسری طرف اس تحریک کی حمایت بھی کرتے ہیں جس کے زیر اثر اکبر اور دوسرے لوگ اسلام کے اخلاق ضابطوں سے رو گردانی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔

مندرجہ ذیل کتب وصول ہوئیں :

(۱) **الہامی پیش گوئیاں مؤلفہ سعید بن وحید دیندار انجمن کراچی ۔**

(۲) **اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام ، مؤلفہ جناب اسرار احمد شائع** کردہ ادارہ اشاعۃ الاسلامیہ لاہور ۔ **قیمت ایک روپیہ ۔**

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Karachi

This Journal is devoted to research studies on the life, poetry and thought of Iqbal and on those branches of learning in which he was interested: Islamics, Philosophy, History, Sociology, Comparative Religion, Literature, Art, Archaeology, etc., etc.

Published alternately

in

English and Urdu

Subscription

(for four issues)

Pakistan		Foreign countries
Rs. 15.00		35s or $5.00
	Price per copy	
Rs. 4.00		9s or $1.50

All contributions should be addressed to the Editor, Iqbal Review, 43-6/D, Block No. 6, P.E.C.H. Society, Karachi—29. The Academy is not responsible for the loss of any article in any manner whatsoever. No articles are returned unless accompanied with a stamped envelope.

Publishd by B.A. Dar, Director, Iqbal Academy, Karachi
Printed at Zarreen Art Press, 61 Railway Road, Lahore

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Karachi

January 1969

IN THIS ISSUE

THE IQBAL ACADEMY,
KARACHI